ماہنامہ

حکمت قرآن

لاہور

مدیر مسئول:

ڈاکٹر اسرار احمد

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

۳۶-کے، ماڈل ٹاؤن - لاہور ۱۴

وَمَنْ يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ
خَيْرًا كَثِيرًا

(البقرہ: ۲۶۹)

ماہنامہ حکمتِ قرآن لاہور

جاری کردہ: ڈاکٹر محمد رفیع الدین، ایم اے، پی ایچ ڈی، ڈی لٹ، مرحوم

مدیر اعزازی: ڈاکٹر ابصار احمد، ایم اے، ایم فل، پی ایچ ڈی،

معاون مدیر: حافظ عاکف سعید، ایم اے (فلسفہ)

—— یکے از مطبوعات ——

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

۳۶-کے ماڈل ٹاؤن لاہور ۱۴

فون: ۸۵۲۶۱۱

زرِ سالانہ /۲۰ روپے

اس شمارے کی قیمت =/۲

ماہنامہ

حکمتِ قرآن

لاہور

مئی، جون ۱۹۸۲ء

جلد: ۱ شمارہ: ۳، ۴

ناشر: ڈاکٹر اسرار احمد

طابع: ایس اے سلیم

مطبع: آفتاب عالم پریس
۱۳- ہسپتال روڈ، لاہور

مقامِ اشاعت: قرآن اکیڈمی
۳۶، کے، ماڈل ٹاؤن لاہور

فہرس

○ حکم و عبر
اسرار احمد ۳

○ شذرۂ تعزیت
(بر سانحۂ ارتحال ڈاکٹر رفیع الدین)
ڈاکٹر اسرار احمد ۸

○ دیباچہ "حکمتِ اقبال"
ڈاکٹر محمد رفیع الدین مرحوم ۱۱

○ قرآن کا اسلوب
ڈاکٹر اسرار احمد ۱۵

○ قرآنی علم و فہم کا درجۂ حکمت
مولانا محمد تقی امینی ۲۵

○ قرآن کریم اور ضمیرِ بیدار
حافظ احمد یار ۳۹

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حِکَم و عِبَر

اسرار احمد

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور' کے زیرِ اہتمام 'حکمتِ قرآن' کے پہلے شمارے کے لئے کچھ لکھنے کا خیال آتے ہی دل پر اک چوٹ سی لگی اور ڈاکٹر محمد رفیع الدین مرحوم و مغفور کا سراپا نگاہوں میں گھوم گیا ——— اور خاص طور پر ان کا مطمئن اور متبسم چہرہ چشم تصوّر کے عین سامنے آن کھڑا ہوا۔ ——— اس لئے کہ اس مجلّے کا نام 'حکمتِ قرآن' ڈاکٹر صاحب موصوف ہی کی امانت ہے ——— اور اس کا اجراءِ اوّل ان ہی کی قائم کردہ 'آل پاکستان اسلامک ایجوکیشن کانگریس' کے تحت ہوا تھا۔

دسمبر ۱۹۶۷ء کے ماہنامہ 'میثاق' کے تذکرہ و تبصرہ کے اوراق میں راقم الحروف کی ایک طویل تحریر شائع ہوئی تھی جس میں برصغیر پاک و ہند میں 'رجوع الی القرآن' کی اس تحریک کی پوری تاریخ بیان کی گئی تھی جس کا آغاز امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ سے ہوا تھا۔ اور جو بعد کے ادوار میں مختلف دھاروں میں منقسم ہو کر آگے بڑھی جن میں سے بعض تو "ضَلُّوا فَاَضَلُّوا" کا مصداق کامل بن گئے، اور بعض صحت مند خطوط پر آگے بڑھے اور تا حال کچھ متوازی سے انداز میں آگے بڑھ رہے ہیں، اور راقم کے نزدیک اس وقت شدید ترین ضرورت اس امر کی ہے کہ ان میں تالیف و امتزاج کا رنگ پیدا ہو۔ اور فہم و فکرِ قرآن کے تمام صحت مند دھارے باہم مل کر ایک زبردست علمی و تحریکی قوت بن جائیں ——— (اور اپنی امکانی حد تک راقم اسی کے لئے کوشاں ہے!) 'حکمتِ قرآن' کی آئندہ اشاعت میں انشاء اللہ وہ پوری تحریر اس موضوع سے متعلق راقم کی بعض دوسری تحریروں سمیت "**دعوتِ رجوع اِلی القرآن کا منظر و پس منظر**" کے عنوان سے شائع کر دی جائے گی۔

راقم کے نزدیک 'فہم قرآن' کو اگر دو حصّوں میں تقسیم کیا جائے۔ یعنی ایک 'علم قرآن' اور

دوسرے 'حکمتِ قرآنی' تو مقدم الذکر کے اعتبار سے بلاشبہ اوّلیت و اقدمیت کا مرتبہ و مقام حاصل ہے ان" راسخونَ فی العلم" علماء کرام کو جو نہ صرف یہ کہ عربی زبان و ادب اور علومِ دینیہ (صرف، نحو، معانی، بیان، تفسیر، حدیث، فقہ وغیرہ) پر پوری دسترس رکھتے ہوں بلکہ اسلاف کے "العروۃ الوثقیٰ" کو بھی مضبوطی سے تھامے ہوئے ہوں، وہاں 'حکمتِ قرآنی' کے بحرِ ذخار کی غواصی اس کے بغیر ممکن نہیں ہے کہ نہ صرف فلسفہ قدیم و جدید پر گہری نگاہ ہو بلکہ عہد جدید کے علوم طبیعیہ (ریاضی، طبیعات، کیمیا، فلکیات، ارضیات، حیاتیات، عضویات اور نفسیات) سے بھی کم از کم اجمالی واقفیت ضرور رکھتے ہوں۔ مقدم الذکر گروہ میں میرے نزدیک دورِ حاضر کا اہم ترین سلسلہ ہے حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ اور شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کا ـــــ اور موخر الذکر حلقے کی عظیم شخصیتیں ہیں ڈاکٹر علامہ اقبال مرحوم و مغفور اور ڈاکٹر محمد رفیع الدین مرحوم و مغفور!! واللہ اعلم!

یہ عجیب اتفاق ہے کہ ڈاکٹر صاحب مرحوم اور ان سطور کا راقم دونوں بالکل ایک ہی وقت وارد لاہور ہوئے ـــــ راقم الحروف ۵۴ء میں ایم بی بی ایس کے آخری امتحان سے فارغ ہو کر جو لاہور سے گیا تھا تو پھر پورے گیارہ سال بعد اواخر ۶۵ء میں دوبارہ وارد لاہور ہوا ـــــ اور ۶۶ء سے اس نے اپنی ان سرگرمیوں کا آغاز کیا جن کے نتیجے میں اولاً ماہنامہ 'میثاق' کا دوبارہ اجراء ہوا، اور 'دار الاشاعت الاسلامیہ' کا قیام عمل میں آیا ـــــ اور پھر آگے چل کر 'مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور" اور "تنظیم اسلامی' کی تاسیس ہوئی ـــــ ادھر ڈاکٹر رفیع الدین ۶۵ء میں 'اقبال اکیڈمی کراچی' (حال لاہور) کی ڈائریکٹری سے فارغ ہوئے اور اواخر ۶۵ء ہی میں لاہور منتقل ہوئے اور ۶۶ء میں انہوں نے 'آل پاکستان اسلامک ایجوکیشن کانگریس' قائم کی جس کے تحت مجلّہ اسلامی تعلیم' (بزبان اردو) اور 'اسلامک ایجوکیشن (بزبان انگریزی) جاری ہوا ـــــ اور بعد میں 'حکمتِ قرآن' کا اجراء عمل میں آیا۔

ڈاکٹر صاحب اور راقم الحروف کی عمروں میں اگرچہ یقیناً ایک نسل کا فصل (مروجہ اصطلاح میں GENERATION GAP) تھا لیکن فکر و مزاج کی ہم آہنگی اور یگانگت کے باعث ۶۷ء تا ۶۹ء راقم کے نہایت قریبی مراسم ڈاکٹر صاحب کے ساتھ قائم رہے، اکثر ڈاکٹر صاحب راقم کے مطب میں آ بیٹھتے تھے اور گھنٹوں نشست رہتی تھی اور بارہا ڈاکٹر

صاحب نے راقم کو باصرار صبح ناشتہ پر بلایا اور نہایت پُرتکلف ناشتہ کرایا لیکن افسوس کہ یہ صحبتیں ع "خوش درخشید ولے شعلۂ مستعجل بود!" کے مصداق جلد ہی ختم ہو گئیں اور اواخر ۶۹ء میں ع "آں قدح بشکست وآں ساقی نماند!" والا معاملہ ہو گیا ـــــــ فیا اسفا ویا حسرتا !!

ڈاکٹر صاحب کے انتقال کے بعد اگرچہ ان کے بعض رفقاء نے ان کے مشن کو جاری رکھنے کی پوری کوشش کی لیکن چونکہ ان میں سے اکثر حضرات سرکاری ملازمت میں تھے۔ لہٰذا وہ بس ایک حد تک ہی وقت دے سکے نتیجۃً رفتہ رفتہ صورت یہ ہو گئی کہ "آل پاکستان اسلامک ایجوکیشن کانگریس" کا نام اور دفتر تو باقی رہ گئے 'کام' ختم ہو گیا چنانچہ 'حکمتِ قرآن' نے بھی دو ایک ہچکیاں لیں اور دم توڑ دیا۔ اس اثنا میں مشیتِ ایزدی سے راقم کے ذاتی مراسم ڈاکٹر صاحب کے دوست اور رفیق کار اور ایجوکیشن کانگریس کے ڈائریکٹر چودھری مظفر حسین صاحب سے اس حد تک استوار ہو گئے کہ اس کی درخواست پر انہوں نے اپنے رفقاء سے مشورے کے بعد 'حکمتِ قرآن' کا ڈیکلریشن SURRENDER کر دیا جس کے لئے راقم نے درخواست دے دی جو ضروری مراحل سے گذر کر منظور ہو گئی ـــــــ اور اس طرح 'حکمتِ قرآن' کا یہ اجراءِ ثانی عمل میں آیا ـــــــ راقم اسی کرم فرمائی کے لئے چودھری مظفر حسین صاحب اور ان کے رفقاءِ کار کا دل سے ممنون ہے۔

راقم کا یہ معاملہ بھی دلچسپ اور عجیب ہے کہ 'میثاق' بھی اولاً مولانا امین احسن اصلاحی مدظلہ نے جاری کیا تھا لیکن حالات کچھ ایسا رُخ اختیار کر گئے کہ وہ اسے جاری نہ رکھ سکے چنانچہ راقم جب لاہور منتقل ہوا تو اس کی اشاعت کئی ماہ سے معطل تھی اور راقم ہی کو اس کی 'تجدید' کی سعادت بھی حاصل ہوئی۔ اب یہی سعادت راقم کو 'حکمتِ قرآن' کے ضمن میں نصیب ہو رہی ہے ـــــ فللہ الحمد والمنۃ!

اس پر بے اختیار علامہ اقبال مرحوم کی معرکۃ الآراء نظم 'ذوق و شوق' کا یہ شعر ذہن میں آ رہا ہے ؎

"میں کہ میری نوا میں ہے آتشِ رفتہ کا سُراغ
میری تمام سرگذشت کھوئے ہوؤں کی جستجو!!"

بہر حال ایک بات اب بہت مناسب ہو گئی ہے، یعنی یہ کہ 'حکمتِ قرآن' انجمن خدام القرآن

کے زیر اہتمام طبع ہوگا ـــــ اور 'میثاق' اللہ تعالیٰ سے 'میثاق الست' اور 'میثاق ایمان' کی تجدید و توثیق کی دعوت کا نقیب بن کر 'تنظیم اسلامی' کے آرگن کی حیثیت سے شائع ہوگا ـــــ اللہ تعالیٰ ان دونوں مجلّوں کو اپنے دین متین اور کتاب مبین کی خدمت کی بیش از بیش توفیق عطا فرمائے۔ آمین!

چودھری مظفر حسین صاحب سے ڈاکٹر صاحب کی لاہور منتقلی کی جو 'شانِ نزول' معلوم ہوئی اس کا ذکر ایک خاص اعتبار سے بہت دلچسپ ہے ـــــ اس لئے کہ جیسا کہ راقم کے احباب کے علم میں ہے راقم اس دور کا سب سے بڑا 'حکیم القرآن' سمجھتا ہے علامہ اقبال مرحوم کو اور ان کی 'حکمت قرآنی' کا واحد شارح سمجھتا ہے ڈاکٹر رفیع الدین مرحوم کو۔ اور لاہور نقل مکانی کے سلسلے میں ان دونوں حضرات کے مابین ایک عجیب کڑی کی حیثیت حاصل ہے مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم کو ـــــ یہ تو سب کو معلوم ہے کہ مولانا کی دکن سے پنجاب منتقلی کا ذریعہ علامہ مرحوم ہی تھے۔ جنہوں نے چوہدری نیاز علی مرحوم کے ذریعے مولانا کو پنجاب آکر "دارالاسلام" میں ڈیرہ لگانے کی دعوت (اگرچہ وہاں مولانا کے ساتھ اولاً معاملہ عدم موافقت ہی کا رہا تھا) ـــــ

اب سنئے کہ ڈاکٹر رفیع الدین لاہور کیسے منتقل ہوئے! چوہدری مظفر حسین راوی ہیں کہ سابق صدر ایوب کی صدارت اور نواب کالاباغ کی گورنری کے دوران مغربی پاکستان کی حکومت کے اہم وزیر ملک خدا بخش بُچہ نے ان سے کہا کہ کسی ایسے شخص کو تلاش کرو جو نظام تعلیم کو اسلامی رُخ پر تبدیل کرنے کی صلاحیت تو پوری رکھتا ہو لیکن اس پر جماعت اسلامی کی چھاپ نہ ہو۔ چوہدری صاحب، مولانا مودودی کے نیاز مندوں ہی میں سے نہیں، عقیدت مندوں میں سے تھے انہوں نے اس کا ذکر مولانا مرحوم سے کیا۔ تو ان کا کہنا ہے کہ بغیر ایک لمحے کے توقف کے مولانا نے فوراً ڈاکٹر محمد رفیع الدین صاحب کا نام لیا (جن سے چوہدری صاحب اس وقت تک بالکل ناواقف تھے)۔ اب چوہدری صاحب کے لئے مسئلہ یہ تھا کہ ڈاکٹر صاحب کو کہاں تلاش کریں اور کس کے ذریعے ان سے رابطہ قائم کریں ـــــ اللہ تعالیٰ نے یہ مشکل سید اللہ بخش صاحب گیلانی مرحوم کے ذریعے حل کرا دی جو ان دنوں گورنمنٹ کالج لاہور میں فلسفے کے استاد تھے ـــــ اور اسطرح ڈاکٹر صاحب لاہور منتقل ہوئے (اگرچہ یہ منتقلی بھی ڈاکٹر صاحب کو راس بالکل نہ آئی اور بُچہ صاحب اپنے سارے اختیار و اقتدار کے باوصف اس وقت کی بیوروکریسی کی مخالفت

کے باعث ڈاکٹر صاحب کو کسی موزوں کام پر نہ لگا سکے، جس سے دل برداشتہ ہو کر ڈاکٹر صاحب نے اپنے طور پر کام شروع کر دیا!) ـــــ الغرض وہ دائرہ مکمل ہو گیا کہ علامہ اقبال نے لاہور بلوایا مولانا مودودی کو اور مولانا نے لاہور بلوایا علامہ کے معنوی جانشین ڈاکٹر رفیع الدین کو!

اس شمارے کا آغاز راقم ایک تو اپنے اُس شذرے سے کر رہا ہے جو اس نے ڈاکٹر رفیع الدین مرحوم کے انتقال پر سپردِ قلم کیا تھا اور جو 'میثاق' کی دسمبر ۶۹ء کی اشاعت میں ہوا تھا ـــــ دوسرے ڈاکٹر صاحب کی وہ آخری تحریر بھی اس اشاعت میں شامل کی جا رہی ہے جو اپنی آخری تصنیف 'حکمتِ اقبال' کے دیباچہ کے طور پر ڈاکٹر صاحب نے سپردِ قلم کی تھی۔

مزید برآں ایک نہایت قیمتی مقالہ، مولانا محمد تقی امینی، ناظم سُنّی دینیات، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کا ـــــ اور ایک نہایت مفید تحریر "قرآن اور ضمیرِ بیدار" کے عنوان سے پروفیسر حافظ احمد یار صاحب کی شاملِ اشاعت ہیں؛ ـــــ راقم کی ایک نشری تقریر "اسلوبِ قرآن" بھی ان شاء اللہ دلچسپی کا موجب ہو گی۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ اس شمارے سے 'حکمتِ قرآنی' کی نشر و اشاعت کا جو نیا سلسلہ شروع ہو رہا ہے اسے دوام بھی حاصل ہو اور قبولِ عام بھی! وما ذالک علی اللہ العزیز!

اس پہلے شمارے کا ابتدائیہ تو راقم نے لکھ دیا ہے، لیکن آئندہ کے لئے یہ پرچہ کُلیّۃً حوالے رہے گا ڈاکٹر ابصار احمد سلمہٗ کے جو قرآن اکیڈمی کے اعزازی ڈائرکٹر ہیں ـــــ اور نورِ چشم حافظ عاکف سعید سلمہٗ کے جو قرآن اکیڈمی کی رفاقت سکیم کے شریکِ اوّل ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان دونوں کو ضروری ہمت اور صلاحیت عطا فرمائے۔ آمین!

خاکسار، اسرار احمد

روزہ کے بارے میں حدیث قدسی کے الفاظ

"فَاِنَّهٗ لِیْ وَ اَنَا اَجْزِیْ بِهٖ"

متفق علیہا ہیں، یعنی صحیح بخاری اور صحیح مسلم دونوں میں موجود ہیں:۔

ترجمہ:۔ روزہ خاص میرے لئے ہے اور میں خود ہی اس کی جزا دوں گا۔"

شذرۂ تعزیت بر

سانحۂ ارتحال ڈاکٹر محمد رفیع الدین

(شائع شدہ 'میثاق'، دسمبر ۱۹۶۹ء)

اس دوران جو اندوہناک حادثہ پیش آیا اس سے قارئین 'میثاق' واقف ہی ہیں۔ جناب ڈاکٹر محمد رفیع الدین صاحب مرحوم و مغفور کی موت عام حالات میں بھی واقع ہوتی تو کم غم انگیز نہ ہوتی۔ لیکن اب جس صورت میں یہ حادثۂ فاجعہ پیش آیا ہے اس نے تو واقعتہً سب کے دل ہلا کر رکھ دیئے ہیں ـــــ اللہ تعالیٰ مرحوم پر اپنی رحمتوں کی بارش فرمائے اور ان کی رُوح کو اعلیٰ علیین میں جگہ دے ـــــ اور ان کے جملہ پسماندگان کو صبرِ جمیل کی توفیق عطا فرمائے! (آمین)

راقم نے آج سے تقریباً پندرہ سال قبل ڈاکٹر صاحب کی تصنیف 'قرآن اور علم جدید' پڑھی تھی اور اسی وقت سے ایک حسنِ ظن ان کی ذات کے ساتھ پیدا ہو گیا تھا۔ انہی دِنوں جب ان کے ایک عزیز سے جو گورنمنٹ کالج منٹگمری میں لائبریرین تھے، یہ معلوم ہوا کہ ڈاکٹر صاحب نہ صرف صوم و صلوٰۃ کے پابند ہیں بلکہ ذکر صبحگاہی کے لذت آشنا بھی ہیں تو ان کی ذات سے ایک باقاعدہ غائبانہ عقیدت کا تعلق پیدا ہو گیا تھا۔ ۱۹۶۱-۶۲ء میں کراچی میں ڈاکٹر صاحب سے ایک دو بار ملاقات بھی ہوئی ـــــ تاہم ان سے راقم کے براہِ راست روابط کی عمر دو ڈھائی سال سے زیادہ نہیں ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ مناسبتِ طبع اور وحدتِ فکر کی وجہ سے اس مختصر مدت میں بھی نہایت قریبی تعلقات پیدا ہو گئے تھے۔ جن کا ایک مظہر 'میثاق' کے ساتھ

لہ ڈاکٹر صاحب کا انتقال لارنس روڈ کراچی پر ایک حادثہ میں ہوا۔ ڈاکٹر صاحب جس رکشا میں سوار تھے اسے ایک بس نے روند ڈالا۔ نتیجۃً ڈاکٹر صاحب بھی بری طرح کچلے گئے۔ حتیٰ کہ ان کا مغز سڑک پر بکھر کر رہ گیا ـــــ انا للہ وانا الیہ راجعون!

ڈاکٹر صاحب کا مستقل قلمی تعاون تھا۔ (اگرچہ اس پر ڈاکٹر صاحب کو اپنے بعض احباب کی ناخوشی کا سامنا بھی کرنا پڑتا تھا ـــــ ذاتی طور پر بھی راقم پر ڈاکٹر صاحب کی شفقتیں اور عنایتیں روز افزوں تھیں۔ چنانچہ اس حادثہ فاجعہ پر بہت سے احباب نے بالکل بجا طور پر راقم کو تعزیت کا حقدار گردانا ـــــ فجزاھم اللہ احسن الجزاء۔

ڈاکٹر صاحب کی علمی حیثیت کے بارے میں راقم کا کچھ عرض کرنا اپنی حدود سے تجاوز ہے ـــــ پائدار علمی کاموں کی قدر بالعموم دیر ہی سے ہوتی ہے۔ خصوصاً ہمارے یہاں تو زندگی میں قبول عام صرف صحافی قسم کے مصنفین کو حاصل ہوتا ہے۔ تاہم زمانہ بہترین منصف ہے۔ اور بقاءِ دوام صرف پائدار اور باوقار علمی تصانیف ہی کو حاصل ہوتا ہے اور انشاء اللہ زمانہ جلد ہی ڈاکٹر صاحب کے علمی مقام و مرتبہ کو پہچان لے گا ـــــ تاہم راقم کے نزدیک ڈاکٹر صاحب کی اصل قدر و قیمت اور وقعت و عظمت اس اعتبار سے تھی کہ وہ ایک سچے خدا پرست اور راسخ العقیدہ مسلمان تھے اور محبتِ خداوندی ان کے پورے وجود میں سرایت کئے ہوئے تھی ـــــ اور خصوصاً اس اعتبار سے ان کے دل و دماغ میں ایسی کامل ہم آہنگی پائی جاتی تھی کہ یہ کہنا مشکل تھا کہ ان کا دل زیادہ مسلمان ہے یا دماغ ـــــ!! اور یہی چیز ہے جو اس دور میں بالکل عنقا ہے۔ اس لئے کہ اس گئے گذرے زمانے میں بھی علم و ایمان کے خزانے علیحدہ علیحدہ تو مل جاتے ہیں۔ یکجا نظر نہیں آتے ـــــ!!

سچی خدا پرستی کے علاوہ ڈاکٹر صاحب کی صحبت سے ایک نہایت گہرا اور نمایاں اثر مرحوم طیب پر اس بات کا پڑتا تھا کہ ڈاکٹر صاحب اسلام کے شاندار مستقبل پر پختہ اور غیر متزلزل یقین رکھتے تھے ـــــ اور اگرچہ پچھلے دنوں بعض ملکی حالات سے وہ بہت مضطرب رہے۔ حتیٰ کہ وقتی طور پر دل برداشتہ بھی رہے تاہم ان کے اس یقین میں ہرگز کوئی کمی نہیں آئی کہ مستقبل کی عالمگیر ریاست اسلام کی عطا کردہ سچی خدا پرستی کی بنیاد ہی پر قائم ہوگی۔

اور راقم کی رائے میں یہی ڈاکٹر صاحب کے پورے فکر کے وہ دو مرکزی خیال ہیں جن کے گرد ان کی تمام تصانیف کا تانا بانا قائم ہے ـــــ یعنی ایک یہ کہ انسان کا صحیح نصب العین ایک ہی ہے اور وہ ہے محبتِ خداوندی اور دوسرے یہ کہ نوعِ انسانی جس سمت سفر کر رہی ہے اس کی بھی بس ایک ہی منزل ممکن ہے اور وہ ہے اسلام!!!

چنانچہ ڈاکٹر صاحب کی آخری تصنیف 'حکمت اقبال' کا انتساب' اس اعتبار سے بڑا معنی خیز ہے کہ اس میں انہوں نے اپنا پورا فکر سمو کر رکھ دیا ہے۔ یعنی :

"ان عاشقانِ جمال ذات کے نام جو مستقبل کی اس ناگزیر عالمی ریاست کا آغاز کریں گے جو اسلام کی اس حکیمانہ توجیہہ پر قائم ہو گی جس کا نام فلسفۂ خودی ہے !"

راقم کے نزدیک 'عاشقِ جمالِ ذات' کا جامہ اس دور کے معروف پڑھے لکھے لوگوں میں سب سے زیادہ جس پر راست آتا تھا وہ خود ان ہی کی ذات تھی اور ان کی وفات سے محبتِ خداوندی کی محفل کی ایک اور شمع گل ہو گئی ـــــــ یا ایتھا النفس المطمئنۃ ارجعی الیٰ ربکِ راضیۃً مرضیۃً فادخلی فی عبادی وادخلی جنتی !

ایک بات کا خیال البتہ آتا ہے کہ اتنی عظیم ہستی اور ایسی مرگِ ناگہاں۔ بلکہ کسمپرسی کی موت ماتم کی جا ہے کہ ہمارے یہاں بلیک مارکیٹیے اور سمگلر لمبی لمبی کاروں میں پھرتے ہوں اور ایسے ایسے صاحبِ کمال لوگ اس طرح رکشاؤں میں سفر کریں اور ہر طرح کے خطرات کی عین زد میں رہیں۔ بقول ذوق ؎

یوں پھریں اہلِ کمال آشفتہ حال افسوس ہے ـــ اے کمال افسوس ہے تجھ پر کمال افسوس ہے

لیکن پھر خیال آتا ہے کہ شاید اللہ تعالیٰ کا اپنے "عاشقوں" کے ساتھ کوئی خاص ہی معاملہ ہے اور ؏ " شمع یہ سودائی دلسوزئ پروانہ ہے "

کے مصداق یہ شمع اب پروانوں کی دلسوزی ہی کی سودائی نہیں بلکہ ان کی کامل شکستگی کی طالب ہے کہ

" کہ شکستہ ہو تو عزیز تر ہے نگاہِ آئینہ ساز میں "

اور "عاشقانِ جمالِ ذات" سے تو شاید " بخاک و خون غلطیدن " سے کم کسی بات پر معاملہ ہی نہیں ہوتا ! ؎

" بنا کردند خوش رسمے بخاک و خون غلطیدن "
خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را "

قرآن ـــــــ معیارِ حق و باطل اور
سنت ـــــــ صراطِ مستقیم کا عملی نمونہ ہے

ڈاکٹر محمد رفیع الدین مرحوم و مغفور کی آخری تحریر

دیباچہ

حکمتِ اقبال

[ڈاکٹر محمد رفیع الدین مرحوم و مغفور کی آخری تصنیف 'حکمتِ اقبال' ہے جس کی طباعت کے مراحل ان کی وفاتِ حسرت آیات سے چند ہی روز قبل مکمل ہوئے تھے۔ بڑے سائز پر نہایت باریک اور گنجان کتابت کے قریباً پانچ سو صفحات پر مشتمل اس درجہ عالمانہ کتاب کو علمی کتاب خانہ، اردو بازار لاہور نے شائع کیا ہے۔ اس کتاب پر مفصل تبصرہ تو انشاء اللہ جلد ہی پروفیسر محمد منور صاحب کے قلم سے پیش ہوگا۔ فی الحال اس کا دیباچہ ذیل میں شائع کیا جا رہا ہے ——

کچھ اس سبب سے کہ ہمارے اندازے میں یہی ڈاکٹر صاحب کی آخری تحریر ہے اور اس اعتبار سے اس کو اب ایک تاریخی حیثیت حاصل ہوگئی ہے اور زیادہ تر اس وجہ سے کہ اس میں ڈاکٹر صاحب نے نہ صرف یہ کہ اپنی جملہ تصانیف کا اجمالی تعارف خود کرایا ہے —— بلکہ اپنے پورے تصنیفی سلسلے کے معنوی ربط کو بھی واضح کر دیا ہے۔ اس طرح اس مختصر سی تحریر کو ڈاکٹر صاحب کی تصانیف کے مطالعے کی خواہش رکھنے والے لوگوں کے لئے ایک قیمتی کلید کی حیثیت حاصل ہوگئی ہے!! (مدیر) ——]

عرصہ دراز تک اقبال کا مطالعہ کرنے کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ اقبال کے تصورات علمی اور عقلی اعتبار سے نہایت برجستہ۔ نہ در دار۔ درست اور ناقابل تردید ہیں اور اگرچہ یہ تصورات اس کی نظم اور نثر کی کتابوں میں جابجا بکھرے ہوئے پڑے ہیں۔ تاہم ان میں ایک علمی اور عقلی ربط موجود ہے۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ سب کے سب صرف ایک تصور سے ماخوذ ہیں جسے اقبال خودی کا تصور کہتا ہے۔ لہٰذا اقبال کی تشریح کا مطلب یہ ہونا چاہیئے کہ خودی کے مرکزی تصور کے ساتھ اس کے دوسرے تمام تصورات کے علمی اور عقلی ربط کو واضح کیا جائے اور اگر ایسا کرنے کے بغیر اس کی کوئی تشریح کیجائے گی تو وہ مسلمانوں کے لئے بالعموم اور غیر مسلموں کے لئے بالخصوص پوری

طرح سے قابل فہم اور تسلی بخش نہیں ہو سکے گی۔ دراصل اس وقت بھی اقبال کے خیالات کے متعلق جس قدر غلط فہمیاں مسلمانوں یا غیر مسلموں میں پائی جاتی ہیں ان کا سبب یہی ہے کہ اقبال کے خیالات کی علمی اور عقلی ترتیب اور تنظیم مہیا نہیں کی گئی۔ دوسرے الفاظ میں میرا نتیجہ یہ تھا کہ اقبال کا فلسفہ دنیا کے اور بڑے بڑے فلسفوں کی طرح بالقوہ انسان اور کائنات کا ایک مکمل اور مسلسل فلسفہ ہے جس کا امتیازی وصف یہ ہوتا ہے کہ اس کے تصورات میں ایک عقلی یا منطقی ترتیب اور تنظیم موجود ہوتی ہے جو اسے مؤثر اور یقین افروز بناتی ہے۔ اور اس بات کی شدید ضرورت ہے کہ اقبال کے تصورات کی مخفی عقلی ترتیب اور تنظیم کو آشکار کر کے اس کے فکر کو ایک مکمل نظام حکمت (PHILOSOPHICAL SYSTEM) کی شکل دی جائے تاکہ وہ نہ صرف پاکستان کے اندر پوری طرح سے قابل فہم بن جائے بلکہ دنیا کے آخری باطل شکن عالمگیر فلسفہ کی حیثیت سے دنیا کے علمی حلقوں میں اپنا مقام حاصل کر سکے۔ لہٰذا میں نے ارادہ کیا کہ جہاں تک ممکن ہو خدا کی توفیق سے اس کام کو انجام دینے کی کوشش کی جائے۔ ظاہر ہے کہ یہ نہایت ضروری تھا کہ اس کام کو انجام دینے کے لئے جو کتاب لکھی جائے اس میں ذیل کے راہ نما اصولوں کو شروع ہی سے مدنظر رکھا جائے۔

اوّل۔ ایک فلسفہ یا نظام حکمت اشخاص کی سند یا شہادت پر مبنی نہیں ہوتا بلکہ علمی حقائق اور عقلی استدلال پر اپنا دارومدار رکھتا ہے۔ اس کے کسی تصور کو اس لئے نہیں مانا جاتا کہ کوئی شخص اس کی حمایت یا سفارش کر رہا ہے بلکہ اس لئے مانا جاتا ہے کہ وہ ایسے علمی حقائق پر مبنی ہے جو معلوم اور مسلّم ہے۔ یا جن کے عقب میں ایسا زوردار عقلی استدلال موجود ہے جو ان سے انکار کی گنجائش باقی نہیں رہنے دیتا۔ اگر فلسفہ میں سند یا شہادت پیش کی جائے تو وہ صرف مؤثر علمی اور عقلی استدلال کے بعد اس کے نتائج کی تائید مزید کے لئے ہی ہو سکتی ہے اور وہ بھی فلسفی کی اپنی نہیں بلکہ ایسے دوسرے اشخاص کی سند اور شہادت ہی ہو سکتی ہے جن کے فکر کی عظمت پہلے سے مسلّم ہو جیسطرح ہیگل یا کسی اور فلسفی نے اپنے کسی حکیمانہ نکتہ کو ثابت کرنے یا لوگوں سے منوانے کے لئے کبھی اپنا ہی قول بطور دلیل کے پیش نہیں کیا۔ ہم بھی اقبال کے نظام حکمت کی تدوین کرتے ہوئے اقبال کے کسی حکیمانہ نکتہ کو ثابت کرنے یا لوگوں سے منوانے کے لئے خود اقبال کا ہی کوئی قول بطور دلیل کے پیش نہیں کر سکتے اور خود اقبال نے بھی اپنے تصورات کی صداقت کو ثابت کرنے کے لئے کبھی اپنے قول کو بطور دلیل کے پیش نہیں کیا۔ بلکہ قوانین قدرت اور حقائق علمی کی طرف اشارے کئے ہیں۔ لہٰذا اقبال کے نظام حکمت کی تدوین کے لئے جو کتاب لکھی جائے گی اس میں اقبال کا

حوالہ نہیں دیا جائے گا بلکہ فقط علمی حقائق اور عقلی استدلال کی مدد سے اقبال کے تصورات کی صحت اور معقولیت کو ثابت کیا جائیگا۔

دوئم۔ اقبال کے تصورات کو علمی اور عقلی اعتبار سے مرتب اور منظم کرنے اور ان کی صحت اور معقولیت کو واضح کرنے کے لئے ضروری ہوگا کہ ہم ایسے علمی حقائق کو انکی عقلی اور علمی بنیادوں کے ساتھ کام میں لایا جائے جو آج تک دریافت ہو چکے ہیں اور اقبال کے تصورات کی تائید کرتے ہیں خواہ ان کو دریافت کرنے والا فلسفہ یا سائنسدان کوئی ہو اور دنیا کے کسی خطہ سے تعلق رکھتا ہو۔

سوئم۔ ان تمام حکیمانہ تصورات اور نظریات کو علمی اور عقلی اعتبار سے غلط ثابت کیا جائے گا جو اقبال کے فکر اور اس کے تصورات سے ٹکراتے ہیں کیونکہ وہ درحقیقت صحیح نہیں ہیں اور معقول استدلال کی روشنی میں ان کو غلط ثابت کیا جا سکتا ہے۔ ایسا کرنے کے بغیر اقبال کے اپنے حکیمانہ تصورات کی صحت اور معقولیت کی پوری پوری وضاحت نہ ہو سکے گی اور لوگوں کو معلوم نہ ہو سکے گا کہ آیا کسی خاص فلسفیانہ مسئلہ کے متعلق صحیح نقطہ نظر اقبال کا ہے یا اُن نظریات کا جو اس کے فکر کے بالمقابل ہیں اور اگر صحیح نقطہ نظر اقبال ہی کا ہے تو اس کی علمی اور عقلی وجوہات کیا ہیں۔

چہارم۔ کتاب انگریزی زبان میں ہو گی تاکہ دنیا کے علمی حلقوں میں اقبال کے فلسفہ کو پڑھا اور پرکھا جا سکے و دوسرے فلسفوں کے بالمقابل اس کے علمی مقام کو معیّن کیا جا سکے اور اس کی معقولیت اور عظمت کو تسلیم کیا جا سکے۔

ان راہ نما اصولوں کی روشنی میں اقبال کے نظام حکمت کی تدوین کے لئے جو کتاب لکھنے کی توفیق مجھے خدا نے عطا کی ہے اس کا نام آئیڈیالوجی آف دی فیوچر (IDIOLOGY OF THE FUTURE) ہے۔ یہ کتاب جون ۱۹۴۳ء میں مکمل ہوئی تھی اور اگست ۱۹۴۶ء میں طبع ہوئی تھی اس کتاب کی اشاعت کے قریباً بیس سال بعد میں نے ان ہی راہ نما اصولوں کی روشنی میں فلسفہ تعلیم پر اس کتاب کے ایک باب کی مزید تشریح اور توسیع کر کے ایک اور کتاب لکھی جس کا نام تعلیم کے ابتدائی اصول (FIRST PRINCIPLES OF EDUCATION) ہے۔ دراصل میری ساری تحریریں "آئیڈیالوجی آف دی فیوچر" (یعنی اقبال کے فلسفہ خودی) کے تصورات اور موضوعات کی مزید تشریح اور توسیع کے طور پر ہی لکھی گئی ہیں۔

چونکہ اقبال نے اپنے فلسفہ خودی کے ذریعے سے اسلام ہی کی فلسفیانہ تشریح کی ہے اور فلسفہ خودی اسلام ہی کا فلسفہ ہے۔ لہٰذا اگر میری کتاب "آئیڈیالوجی آف دی فیوچر" اقبال کا نظام

حکمت ہے تو پھر وہ معاً اسلام کا نظام حکمت بھی ہے۔ لیکن چونکہ یہ کتاب بظاہر مطلق فلسفہ کی کتاب ہے جس میں نہ تو اقبال کا کوئی حوالہ ہے اور نہ قرآن اور حدیث کا۔ اس لئے اس کے پڑھنے والے اسے بالعموم فلسفہ اقبال یا فلسفہ اسلام کی حیثیت سے نہیں بلکہ مطلق فلسفہ کی حیثیت سے پڑھتے رہے ہیں۔ لہٰذا اس کتاب کی اشاعت کے بعد بھی ایک طرف اقبال کے چاہنے والوں کی یہ شکایت باقی رہی کہ اقبال پر لکھنے والوں میں سے کسی نے اقبال کے فلسفہ خودی کو ایک عقلی نظام کے طور پر پیش نہیں کیا۔ یا اس کی مکمل تشریح نہیں کی اور دوسری طرف اسلام سے دلچسپی رکھنے والے بھی بدستور یہ کہتے رہے کہ اس دور میں اسلام سے برگشتہ تعلیم یافتہ مسلمانوں میں اور غیر مسلموں میں اسلام کی تبلیغ کے لئے تعلیمات اسلام کی علمی اور عقلی بنیادیں واضح کرنے اور اسلام کو ایک نظام حکمت کے طور پر پیش کرنے کی شدید ضرورت ہے۔ اس صورت حال کی بنا پر میں نے سمجھا کہ ہماری قوم کے ذوق کے پیش نظر اس بات کی شدید ضرورت ہے کہ اقبال کے فلسفہ خودی پر دو اور کتابیں لکھی جائیں جن میں سے ایک تو ایسی ہو کہ اس میں فلسفہ خودی کو قرآن اور حدیث کے حوالوں کے ساتھ اسلام کے ایک فلسفہ کے طور پر پیش کیا جائے اور دوسری ایسی ہو کہ اس میں فلسفہ خودی کو اقبال کے حوالوں کے ساتھ اقبال کے فلسفہ کے طور پر پیش کیا جائے۔ خدا کا شکر ہے کہ اس نے مجھے دونوں کتابیں لکھنے کی توفیق دی۔ پہلی کتاب جس کا عنوان "قرآن اور علم جدید" ہے۔ میں نے ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور کے لئے ۱۹۵۱ء میں لکھی تھی اور دوسری کتاب 'حکمت اقبال' کے نام سے اب پیش کر رہا ہوں۔ حاصل یہ ہے کہ جس حد تک مجھے خدا کی توفیق حاصل ہوئی ہے میں نے یہ تینوں کتابیں اس طرح لکھی ہیں کہ مجھے امید ہے کہ جو احباب اقبال کے فلسفہ خودی کو یا اسلام کا مطالعہ ایک خالص اور منظم فلسفہ یا سائنس کے طور پر کرنا چاہتے ہیں وہ میری کتاب "آئیڈیالوجی آف دی فیوچر" کا مطالعہ مفید طلب پائیں گے (اس کتاب کے تیسرے ایڈیشن کے ناشر شیخ محمد اشرف کشمیری بازار لاہور ہیں) اور جو فلسفہ خودی کا مطالعہ اسلام کے ایک فلسفے کے طور پر کرنا چاہتے ہیں وہ میری کتاب "قرآن اور علم جدید" کا مطالعہ دلچسپی کا باعث پائیں گے اور پھر جو فلسفہ خودی کا مطالعہ اقبال کے حوالوں کی روشنی میں اقبال کے فلسفہ کے طور پر کرنا چاہتے ہیں وہ زیر نظر کتاب 'حکمت اقبال' کا مطالعہ مدعا کے مطابق پائیں گے۔ امید ہے کہ جو احباب ان تینوں کتابوں کا مطالعہ کریں گے وہ دیکھیں گے کہ فلسفہ خودی کی مفصل تشریح کی حیثیت سے یہ تینوں کتابیں ایک دوسرے کی کمی کو بھی پورا کرتی ہیں

ڈاکٹر اسرار احمد

قرآن کا اسلوب

قرآن حکیم کے اسلوب کے بارے میں سب سے پہلی بات تو یہ جان لی جانی چاہئے کہ یہ نہ تو عام انسانی تصانیف سے مشابہ ہے جس کے تمام ابواب (Chap-ters) مل کر ایک موضوع کی تکمیل کرتے ہیں اور مضمون ایک باب سے دوسرے اور تیسرے میں تدریجاً بڑھتا ہوا تکمیل کو پہنچتا ہے۔ نہ ہی یہ مضامین یا مقالات یا انشائیوں کے مجموعے سے مشابہ ہے جس میں ہر مضمون یا مقالہ یا انشائیہ اپنی جگہ مکمل ہوتا ہے لیکن یہ ضروری نہیں ہوتا کہ باہم ان کے مابین بھی کوئی معنوی ربط یا تسلسل موجود ہو ـــــ چنانچہ قرآن مجید کی سورتوں کی حیثیت نہ تو معروف معنی میں ابواب (CHAPTERS) کی ہے، نہ جداجدا مضامین یا مقالات یا انشائیوں (ESSAYS) کی۔ یہی وجہ ہے کہ ایک تو ان سورتوں کے ناموں کا اکثر و بیشتر کوئی معنوی تعلق ان کے مضامین سے نہیں ہے۔ بلکہ ان کی حیثیت محض علامتوں کی ہے جن سے انہیں علیحدہ علیحدہ پہچان لیا جاتا ہے۔ دوسرے ہر سورت ابتدا سے اختتام تک مسلسل چلتی ہے اور اس میں نہ کوئی ذیلی عنوانات ہیں نہ ہی ضمنی سرخیاں ـــــ بایں ہمہ ہر سورت معنوی اعتبار سے ایک اکائی اور وحدت ہے اور اس میں ابتدا سے آخر تک ایک معنوی تسلسل موجود ہے بالکل ایسے جیسے ایک ڈوری ہو جس میں آیات کے موتی پروئے ہوئے ہوں۔ البتہ معنوی تسلسل کی اس ڈوری کا سراغ قرآن حکیم کے طالب علم کو خود غور و فکر اور تدبر و تفکر سے لگانا پڑتا ہے اور اس میں کوئی مدد نہ سورت کے نام سے ملتی ہے (جیسا کہ عام انسانی تصانیف میں ابواب یعنی (Chap-ters) کے عنوانات سے ملتی ہے) نہ ہی کوئی ذیلی یا ضمنی سرخیاں ہی اس ضمن میں مدد دینے کے لئے موجود ہیں ـــــ پھر سورتوں کے مابین بھی معنوی ربط موجود ہے اور ان کی ترتیب بھی ایک حکمت بالغہ کے تحت ہے اور یہ حکمت

گروپوں یا SECTIONS میں بھی منقسم ہیں لیکن یہ تمام امور بھی جلی نہیں خفی ہیں اور ان کی تعیین و معرفت کے لئے بھی قرآن حکیم کی گہرائیوں میں غوطہ زنی کرنی پڑتی ہے ۔ (بقول علامہ اقبال ؒ "قرآن میں ہو غوطہ زن اے مردِ مسلماں!)

آیات

واضح رہے کہ قرآن مجید کی اِکائی آیت کہلاتی ہے جس کی جمع آیات ہیں، قرآن مجید لگ بھگ ساڑھے چھ ہزار آیات پر مشتمل ہے، جو کُل ۱۱۴ سُورتوں میں منقسم ہیں — آیت کے لفظی معنی نشانی کے ہیں، اور اس لفظ کے استعمال سے ذہن کو اس جانب متوجّہ کرنا مقصود ہے کہ قرآن کی ہر آیت اللہ تعالےٰ کے علمِ کامل اور اس کی حکمتِ بالغہ کی نشانی ہے ۔ آیاتِ قرآنی کا یہ معاملہ بھی بالکل منفرد ہے کہ ان کی تعیین و ترتیب نہ تو نحو یعنی گرامر کے کسی اصول پر مبنی ہے نہ علمِ معانی و بیان کے کسی قاعدے کے تحت ہے نہ ہی منطق کے اصولوں کے تابع ہے بلکہ کہیں تو آیات محض حروفِ مقطّعات پر مشتمل ہیں، جیسے حٰمٓ، الٓمٓ وغیرہ، کہیں مرکّباتِ ناقصہ پر جیسے والعصر یا والفجر وغیرہ، کہیں ایک ایک جملے پر مشتمل ہیں جیسے "اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ" — اور کہیں ایسا بھی ہوا ہے کہ جملہ بیچ میں سے توڑ کر دو آیتوں میں منقسم کر دیا گیا ہے — اور کہیں متعدد مکمّل جملے حتّٰی کہ دس دس جملے ایک ہی آیت میں موجود ہیں جیسے آیۃ الکرسی، یا آیۃ الدَّین وغیرہ

— گویا آیات کی تعیین خالص "توقیفی" معاملہ ہے، یعنی صرف نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بتانے سے معلوم ہوا ہے، ورنہ کسی انسانی اجتہاد یا کسی گرامر یا منطق کے اصول و قواعد کو اس میں کوئی دخل نہیں ہے — بہرحال قرآن حکیم کی ہر آیت علمِ خداوندی اور حکمتِ الٰہیّہ کا ایک نہایت حسین و جمیل موتی ہے، جس کا اپنا معنوی حُسن اور اپنی ذاتی رعنائی اور چمک دمک ہے!!

سُورتیں

"سُورت" کا لفظ "سُور" سے نکلا ہے جس کے معنی ہیں 'فصیل' — اس لفظ کے استعمال سے اس حقیقت کا اظہار مقصود ہے کہ قرآن حکیم کی ہر سُورت ایک شہرِ معنیٰ کی حیثیت رکھتی ہے ۔ جس کے گرداگرد ایک فصیل ہے جو اس کے حدود کا تعین کرتی ہے، پھر ایک شہر تو وہ ہوتا ہے جو بغیر کسی نقشے یا PLANNING

کے خودبخود بے ترتیب یعنی (HAP HAZARD) طریقے پر بستا اور پھر بڑھتا اور پھیلتا چلا جاتا ہے قرآنی سورت کا شہر معنی اُس سے مشابہ نہیں بلکہ اُس شہر کے مماثل ہے جس کے ہر گوشے میں نظم و ضبط نظر آتا ہے اور اُس کی تعمیر باضابطہ نقشے یعنی SCHEME اور PLANNING کے تحت ہوئی ہو — جس طرح قرآنی آیات کی تعیین بالاسناد توقیفی ہے — اور وہ "بہت چھوٹی بھی ہیں" یعنی محض تین تین آیات پر مشتمل" جیسے سورۃ العصر، سورۃ الکوثر اور سورۃ النصر! اور بہت بڑی بھی ہیں جیسے سورۃ بقرہ، سورۃ نساء اور سورۃ اعراف وغیرھا۔

معنوی اعتبار سے ہر سورت کا ایک مرکزی مضمون یا 'عمود' ہوتا ہے جس کی حیثیت اُس معنوی ڈورکی سی ہوتی ہے جس میں آیات کے موتی پروئے ہوتے ہوتے ہیں اور اس پرونے میں جو حسنِ ترتیب پایا جاتا ہے اس سے علم خداوندی اور حکمتِ الٰہیہ کے ان موتیوں کی شان دوبالا ہو جاتی ہے اور اُن میں اضافی معانی پیدا ہو جاتے ہیں۔ اگرچہ باہمی ربط و ترتیب معنوی سے پیدا شدہ یہ اضافی معانی بھی جلی نہیں خفی ہوتے ہیں اور اُن تک رسائی حاصل کرنے کے لئے قرآن کے ایک طالبِ علم کو وقت و محنت اور کدوکاوش کا بہت حصہ صرف کرنا پڑتا ہے۔

سُورتوں میں نسبت زوجیّت

قرآنِ حکیم کی سُورتوں کے باہمی ربط کے ضمن میں اولین حقیقت یہ سامنے آتی ہے کہ وہ اکثر و بیشتر جوڑوں کی شکل میں ہیں اور صرف معدودے چند سُورتیں ایسی ہیں جو جوڑوں کی تقسیم میں فٹ (FIT) نہیں آتیں بلکہ اُن کی حیثیت کسی دوسری سُورت کے ضمیمے یا تتمے کی ہوتی ہے۔ جیسے سورۃ الحجرات، تتمہ یا ضمیمہ ہے سورہ فتح کا اور اس کے جملہ مضامین توضیح و تبیین مزید ہیں سورہ فتح کی آخری دو آیات کی!! — اس بحث سے قطع نظر کہ قرآن مخلوق ہے یا نہیں اور اُس کے الفاظ حادث ہیں یا قدیم، اسلئے کہ یقیناً یہ اللہ کا کلام ہے اور کلام متکلم کی صفت ہوتا ہے اور جملہ صفاتِ الٰہیہ بھی لازماً ذاتِ باری تعالےٰ ہی کے مانند مطلق بھی ہیں اور قدیم بھی — تاہم جو قاعدہ کلیہ قرآن حکیم کے ان الفاظ میں بیان ہوا ہے کہ — "وَمِنْ كُلِّ شَيْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَيْنِ

لَعَلَّکُمۡ تَذَکَّرُوۡنَ " (الذٰریٰت ۴۹) وہ اتنا حتمی اور لازمی ہے کہ مخلوقات کے دائرے سے تجاوز کر کے سورۃ یا قرآنی پر بھی صادق آتا ہے ۔ قرآن حکیم کی سورتوں کے مابین یہ نسبتِ زوجیت بعض جگہوں پر تو اتنی نمایاں ہے کہ ہر شخص کو نظر آجاتی ہے ۔ جیسے سورۃ الفلق اور سورۃ الناس جن کا مجموعی نام "معوذتین" مشہور اور معروف ہے یا جیسے سورۂ بقرہ اور سورہ آل عمران جن کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مشترک نام "الزھراوین" سے موسوم فرمایا ہے ۔ بعض مقامات پر یہ نسبت وتعلق بادنیٰ تامل سمجھ میں آجاتا ہے ۔ جیسے سورۃ الضحیٰ اور سورۃ الم نشرح ـــ یا سورۃ مزمل اور سورہ مدثر ـــ یا سورۃ طلاق اور سورۃ التحریم یا بنی سورہ بنی اسرائیل اور سورۃ کہف میں ـــ لیکن اکثر مقامات پر یہ مضمون بھی حسبِ کم اور خفی زیادہ ہوتا ہے جس کے لئے گہرے غور وفکر اور تدبر وتعمق کی ضرورت ہوتی ہے ۔ چنانچہ بعض ایسے حضرات نے بھی جو قرآن کریم کی سورتوں کے مابین اس نسبت زوجیت سے اصولاً تو واقفیت رکھتے ہیں لیکن تمتوں اور ضمیموں کی صحیح معرفت اور تعیین نہیں کر سکتے اس نسبت زوجیت کی تعیین میں ٹھوکریں کھائی ہیں قرآن حکیم کی سورتوں کے مابین اس نسبت زوجیت کو مختصراً تو ہم ایک ہی تصویر کے دو رُخوں سے تعبیر کر سکتے ہیں اور تفصیلاً یوں سمجھ سکتے ہیں ۔

لہ ایک جوڑے کی دونوں سورتوں میں مشابہت بھی بہت ہوتی ہے ۔ لیکن بعض اعتبار سے دونوں ملکر ایک مضمون کی تکمیل کرتی ہیں جیسے "معوذتین" کا مضمون ایک ہی ہے یعنی "تعوذ باللہ" کی تلقین ۔ لیکن جن بلیات سے تعوذ مطلوب ہے ۔ اُن کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا ۔ ایک وہ جو انسان پر خارج سے حملہ آور ہوتی ہیں ۔ اور دوسری وہ جو انسان پر خود اُس کے اپنے نفس میں اثر ونفوذ یا جراثیم وصلول کے ذریعے اثر انداز ہوتی ہے ۔ مقدم الذکر کے تعوذ کی تلقین سورۃ الفلق میں آگئی ـــ اور مؤخر الذکر سے سورۃ الناس میں ! اسی طرح مثلاً سورۃ صف اور سورۃ جمعہ دونوں کا مضمون ایک ہی ہے ۔ یعنی بعثت محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام لیکن سورۃ صف میں اُس کے مقصد کو متعین کیا گیا ۔ آیت مبارکہ :

هُوَ الَّذِیْ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ کُلِّهٖ وَلَوْ کَرِهَ الْمُشْرِکُوْنَ ۔ یعنی وہی ہے اللہ جس نے بھیجا اپنے رسول کو الہدیٰ (قرآن مجید) اور دین حق (نظام حیات) دے کر تاکہ غالب کرے اس دین کو تمام جنس دین پر چاہے مشرکین کو کتنا ہی ناگوار ہو" یا خواہ بُرا لگے مشرکوں کو!" — اور اس کے لئے جہاد و قتال کی پُرزور دعوت دی گئی اہل ایمان کو — جبکہ سورۃ جمعہ میں آنحضورؐ کے بنیادی طریق کار کو متعین کیا گیا آیت مبارکہ" هُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ وَیُزَکِّیْهِمْ وَیُعَلِّمُهُمُ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَةَ وَاِنْ کَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ ۔" یعنی وہی ہے اللہ جس نے بھیجا اپنے رسُول کو اُمّیوں میں ان ہی سے جو ان پر اللہ کی آیات کی تلاوت کرتا ہے۔ ان کا تزکیہ کرتا ہے اور ان کو کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے اور بے شک وہ اس سے قبل کھلی گمراہی میں تھے" اور اس ضمن میں اہل ایمان کو توجہ دلائی، حامل کتاب الٰہی ہونے کی حیثیت سے اپنی ذمہ داریوں کو ادا کرنے کی جانب، اور کتاب الٰہی کی عوامی تعلیم و تذکیر کے لئے حکم دیا گیا اقامت جمعہ اور اہتمام خطبہ کا اس طرح دونوں سُورتوں نے ملکر ان کے مضمون کی تکمیل کر دی — اور ظاہر ہے کہ یہی نسبت زوجیت کا اصل ماحاصل ہے! — قرآن حکیم کی دو سُورتیں اس نسبت زوجیت کے قاعدہ کلیہ سے بالکل مستثنیٰ نظر آتی ہیں۔ ایک سُورۃ الفاتحہ اور دوسری سورۃ یٰسین کہ نہ تو ان کا کوئی مثنیٰ موجود ہے۔ نہ ہی انہیں کسی دوسری سورت کا ضمیمہ یا تتمہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ ان میں سے بھی سُورۃ الفاتحہ اور سُورۃ الناس کے مضامین پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ ان میں وہ معنوی مشابہت موجود ہے۔ جس نے قرآن کے اوّل و آخر کو ایک نسبت باہمی میں منسلک کر دیا ہے البتہ سُورۃ یٰسین واقعۃً بالکل منفرد سُورت ہے — اور شاید یہ بھی ایک سبب ہوا اسکا کہ آں حضورؐ نے اسے قرآن مجید کا دل قرار دیا ہے۔ واللہ اعلم!!

سُورتوں کے گروپ

قرآن حکیم کی سُورتوں کے مابین ایک معروف و مشہور تقسیم زمانہ نزولی کے اعتبار سے ہے۔ یعنی مکی اور مدنی ۔ لیکن مکّیات، اور مدنیات، مصحف میں بظاہر جس طرح منتشر نظر آتی ہیں۔ گہرائی میں اتر کر غور کیا جائے تو نظر آتا ہے کہ فی الواقع وہ نہ "منتشر" ہیں نہ بے "ترتیب"، جبکہ بقول شاعر ع "وہ ربط محکم اسی بے ربطی تحریر میں ہے!" اور مکّیات اور مدنیات کی اس ترتیب سے قرآن حکیم سات گروپوں (SECTIONS) میں تقسیم ہو گیا ہے۔ جن میں سے ہر گروپ ایک یا ایک سے زائد مکّی اور ایک یا ایک سے زائد مدنی سورتوں پر مشتمل ہے۔ مزید غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح ہر سورت کا ایک مرکزی مضمون یا "عمود" ہوتا ہے اسی طرح سورتوں کے ہر گروپ کا بھی ایک مرکزی مضمون "یا عمود" ہے۔ اور جس طرح ایک جوڑے کی دو سُورتوں میں مضامین کی بایں طور تقسیم ہوتی ہے کہ دونوں ملکر ایک مضمون کو مکمل کرتی ہیں۔ اسی طرح سُورتوں کے ایک گروپ کی مکّیات، اور مدنیّات بھی ایک ہی تصویر کے دو رُخوں کے مانند اُسی گروپ کے "عمود" کے دو پہلوؤں کی وضاحت کرتی ہیں!!

البتہ یہ معاملہ خفی ہونے کے اعتبار سے پہلے ذکر کیے گئے تمام خفی پہلوؤں سے بڑھ کر ہے اور چونکہ اس حقیقت کی جانب توجہ ہوئے بھی زیادہ عرصہ نہیں ہوا لہٰذا اس حقیقت کے اصولی طور پر معلوم ہو جانے کے باوجود تا حال اس کے خاکے میں تفصیلی رنگ بھرنے کے لئے بہت محنت و مشقت درکار ہے!!

بہرحال "مشکلے نیست کہ آساں نشود — مرد باید کہ ہراساں نشود!" کے مصداق کوشش کئے جانے سے ان شاء اللہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان مبارک "لا تنقضی عجائبہ" یعنی قرآن مجید کے عجائب کا سلسلہ کبھی ختم نہیں ہوگا" کے مطابق علم و حکمتِ قرآنی کے لئے نئے نئے آفاق و مطالع ظہور میں آتے رہیں گے!!

اسلوبِ بیان

مصحف کے اسلوب ترتیب کے بعد اب آیئے کہ ایک نگاہ قرآن کے اسلوب

بیان پر بھی ڈال لیں یہ بات تو عرض کی ہی جا چکی ہے - کہ قرآن نہ بحیثیت مجموعی ایک تصنیف ہے نہ مجموعہ مضامین و مقالات - پھر یہ بھی ظاہر و باہر ہے کہ اگرچہ اس میں ایک صوتی آہنگ موجود ہے جو بعض جگہ بہت ہی نمایاں ہے اور بعض جگہ بہت خفی، تاہم قرآن کا اسلوب شعری نہیں ہے بلکہ شاعروں کی تو قرآن نے باستثنائے قلیل شدید مذمت کی ہے —— اور شعر کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے شایان شان قرار نہیں دیا - بفحوائے الفاظ قرآنی : وَمَا عَلَّمْنٰهُ الشِّعْرَ وَمَا يَنْبَغِي لَهٗ ، تو سوال ہے کہ معروف اصناف ادب میں سے قرآن کا اسلوب کس صنف سے مشابہ ہے؟ اس لئے کہ اگرچہ یہ کلام الٰہی ہے - تاہم اس کے مخاطب بہرحال انسان ہیں اور ان کے قلوب و اذہان تک ابلاغ کا ذریعہ اُن کی معروف اور جانی پہچانی چیزیں ہی بن سکتی ہیں - یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالےٰ کا کلام قدیم انسانی زبان کے حروف و اصوات کی صورت میں نازل ہوا —— اس اعتبار سے غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ انسانوں کے معروف اسالیب بیان میں سے "قرآن مجید" کا اسلوب خطبے سے بہت زیادہ مشابہ ہے گویا "قرآن مجید" مجموعہ خطبات الٰہیہ" ہے اس صراحت کے ساتھ کہ اگرچہ اس کی ہر سورت اپنی جگہ ایک مکمل اور مربوط اور خود مکتفی خطبہ بھی ہے تاہم وہ سابق و لاحق سے بھی پوری طرح مربوط اور مسلسل ہے —— اور پورے قرآن کا بھی ایک جامع نظام ہے جس کی کسی قدر وضاحت اس سے قبل ہو چکی ہے -

قرآن مجید کے خطبے کے اسلوب پر ہونے کی بنا پر اس کے فہم کے ضمن میں چند باتیں نہایت اہم ہیں -

(۱) ایک یہ کہ اس میں اکثر مضامین بلا تمہید اس طرح وارد ہو جاتے ہیں جیسے ایک شعلہ بیان خطیب اپنے خطبہ کے دوران بغیر کسی لفظی تمہید و وضاحت کے ایک کے بعد دوسرا اور پھر تیسرا مضمون زیر بحث لے آتا ہے -

(۲) اس کا ایک پہلو یہ ہے کہ خطاب کا رُخ بھی کثرت سے بدلتا رہتا ہے - یعنی یہ کہ ابھی اگر اہل ایمان سے خطاب تھا تو فوراً کفار یا مشرکین سے خطاب شروع ہو جاتا ہے یا ابھی مومنین صادقین سے گفتگو ہو رہی تھی تو فوراً

رُوئے سخن منافقین کی طرف مڑ جاتا ہے اور ایسا اوقات اس تحویل خطاب کی جانب کوئی لفظی اشارہ موجود نہیں ہوتا بلکہ اس کا سراغ غور و فکر سے لگانا پڑتا ہے۔

(۳) اس طرح کبھی یہ بھی ہوتا ہے کہ موجود کو غائب فرض کر کے بصیغہ غائب کلام شروع ہو جاتا ہے۔ اور کبھی اس کے برعکس غائب کو حاضر فرض کر کے بصیغہ حاضر خطاب شروع ہو جاتا ہے۔

(۴) اسی طرح خطبہ ہی کے اسلوب پر یہ بھی ہوتا ہے کہ بظاہر خطاب کسی سے ہے۔ لیکن جو بات کی جا رہی ہے وہ سنانی کسی اور کو مطلوب ہے۔ یا اس کے برعکس بات کسی تمثیل یا قصے کے پیرائے میں ہو رہی ہے۔ حالانکہ مقصود مخاطب کو افہام و تفہیم ہے — یا عنایت و التفات یا تنبیہ و سرزنش۔

۵ — اکثر و بیشتر سورتوں میں خطبات کا یہ وصف بھی نمایاں طور پر موجود ہے۔ کہ آغاز بھی نہایت جامع و محکم — اور پُرہیبت و پُرجلال ہوتا ہے اور اختتام بھی اس کے مانند — لیکن درمیان میں بحث بہت سے گوشوں میں پھیلی ہوئی ہوتی ہے جس میں مثبت دلائل بھی ہوتے ہیں اور مخالفین کے اعتراضات کا رد بھی ہوتا ہے۔ اُمم سابقہ کے واقعات سے استشہاد بھی ہوتا ہے۔ اور امثال و قصص سے عبرت بھی دلائی جاتی ہے اور ان تمام چیزوں کے مابین ربط و تعلق تلاش کرنا بھی بعض اوقات مشکل ہو جاتا ہے۔ لیکن بالآخر بحث پھر ایک نکتے پر منتج ہے اور اکثر و بیشتر جہاں سے بات شروع ہوئی تھی اسی پر ختم ہو جاتی ہے — جیسے اصطلاح میں "اَلْعَوْدُ اِلَی الْبَدْءِ" کہتے ہیں!!

(۶) خطبہ کا ایک اور وصف جو قرآن کے اسلوب میں نمایاں ہے خطاب کا اتار چڑھاؤ ہے جس طرح ایک کہنہ مشق خطیب اپنے خطاب کے دوران کبھی آواز پست کرتا ہے کبھی بلند کبھی نرمی اختیار کرتا ہے کبھی سختی، کبھی تہدید و تنبیہ کا انداز اختیار کرتا ہے کبھی ترغیب و تشویق کا اور کبھی دلیل سے کام لیتا ہے کبھی اپیل سے — اسی طرح قرآن بھی اپنے پیغام کو لوگوں کے دلوں تک پہنچانے کے لئے یہ سارے انداز اختیار کرتا ہے۔ یہ چیز کسی

عرب قاری اور غیر عرب قاری کی قرأت کے مابین نمایاں فرق و تفاوت کا سبب بن جاتی ہے۔ یعنی یہ کہ اگر کوئی قاری قرآن کے معانی و مفاہیم کو نہ سمجھ رہا ہو تو خواہ تجوید و قرأت کے جملہ اصولوں کے مطابق صحیح قرأت کر رہا ہو تو اُس کی قرأت اُس اُتار چڑھاؤ سے خالی رہتی ہے جو معانی و مفاہیم کے اُتار چڑھاؤ پر نظر رکھ کر قرأت کرنے والے قاری کی قرأت میں ہوتا ہے۔ نتیجتاً اثر انگیزی کے اعتبار سے زمین و آسمان کا فرق واقع ہو جاتا ہے۔

اس ضمن میں آخری بات یہ عرض کرنی ہے کہ اگرچہ قرآن شعر کے اسلوب پر نہیں ہے۔ لیکن اس کی ایک اپنی ملکوتی موسیقی اور اس کا ایک اپنا لاہوتی غنا ہے۔ جو ابتدائی مکی سورتوں میں تو بہت ہی نمایاں ہے جن میں آیات چھوٹی چھوٹی ہیں قوافی کا بھی اہتمام ہے — اور ایک Rythm بھی موجود ہے — اور مجموعی اعتبار سے نہایت حسین صوتی آہنگ موجود ہے — جو رُوحِ انسانی کی غذا بنتا ہے۔ یہ دوسری بات ہے اور یہ اعجاز قرآنی کا ایک عظیم مظہر ہے۔ کہ ان میں سے کسی چیز کے ضمن میں قرآن میں کسی مقام پر بھی نہ تصنع و تکلف کا شائبہ تک نظر آتا ہے نہ آوردی کا احساس ہوتا ہے نہ کہیں کوئی ایک لفظ بھی ضرورت سے زائد نظر آتا ہے بلکہ کیفیت وہ محسوس ہوتی ہے۔ جو غالب نے ان الفاظ میں بیان کی کہ :-

گنجینۂ معنی کا طلسم اس کو سمجھیو!
جو لفظ کہ غالب مرے اشعار میں آوے

اور ع زیرِ ہر ہر لفظ غالب چیدہ ام میخانۂ —

مولانا شبیر احمد عثمانی رح نے اپنے حواشی قرآن مجید میں اپنے والد مرحوم کے یہ اشعار درج کیے ہیں کہ

سُنتے سُنتے نغمہ ہائے محفلِ بدعات کو
کان بہرے ہو گئے دل بے مزہ ہونے کو ہے
آؤ سنوائیں تمہیں وہ نغمۂ مشروع بھی
کوہ جس سے خاشعاً متصدعاً ہونے کو ہو!

تو واقعہ یہی ہے کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ قرآن کے اسلوبِ بیان میں
ایک نغمے کی سی کیفیت بھی موجود ہے — جو مثلاً سورۂ رحمٰن میں اپنے
CLIMAX پر ہے یہی وجہ ہے کہ آنحضورؐ نے اسے قرآن مجید کی دلہن قرار
دیا ہے۔ بفحوائے الفاظِ نبویؐ "سورۃ الرحمٰن عروس القرآن" —
طویل مکیات اور بعد ازاں مدنیات میں یہ وصف اگرچہ کسی قدر خفی ہو جاتا ہے۔
لیکن قرآن سے مناسبت طبع رکھنے والوں کو خوب معلوم ہے کہ ایک صوتی
آہنگ اور ایک مخصوص RYTHM وہاں بھی موجود ہے —
ابتدائی مکیات اور مابعد کی سورتوں کے مابین اسلوب کے فرق و تفاوت
کو ایک پہاڑی ندی اور میدانی دریا کے مابین فرق و تفاوت
سے سمجھا جا سکتا ہے۔ پہاڑی ندیوں کے پاٹ تنگ ہوتے ہیں، گہرائی زیادہ
ہوتی ہے۔ پانی کا بہاؤ تیز ہوتا ہے — اور جوش و خروش نمایاں ہوتا ہے
اور اس کا بھی ایک مجموعی سرود ہوتا ہے۔ بقول علامہ اقبال

ع "ندی کی شورشوں میں باجا سا بج رہا ہو!" —

جبکہ میدانی دریاؤں کے پاٹ چوڑے ہو جاتے ہیں، گہرائی کم رہتی ہے
— بہاؤ بھی تیز نہیں رہتا — اور جوش و خروش کے بجائے سکون اور
خاموشی کی سی کیفیت طاری رہتی ہے — جس سے ایک دوسرے ہی رنگ
کا سرود وجود میں آتا ہے یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالےٰ نے جن لوگوں کو حسنِ صوت
کی نعمت عطا فرمائی ہے۔ نبی اکرمؐ نے ان پر واجب ٹھہرایا ہے کہ وہ اس کے
ذریعے قرآن کے حسنِ صوتی کو اجاگر کریں — بفحوائے فرمانِ نبویؐ "زیّنوا
القرآن باصواتکم" — یعنی قرآن کو اپنی آوازوں سے مزیّن کرو اور
من لم یتغن بالقرآن . . . . یعنی . . .

— اللہ تعالےٰ ہمیں قرآن حکیم سے مناسبت طبع، اور اس کے اسلوب
سے واقفیت عطا فرمائے۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

□□□□□□□□□□□

مولانا محمد تقی امینی

قرآنی علم و فہم کا درجۂ حکمت

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، انڈیا کے ناظم سنی دینیات، مولانا محمد تقی امینی صاحب نے یہ قابل قدر علمی مقالہ انجمن کے تحت منعقد ہونے والے محاضرات قرآنی (منعقدہ ۱۹ تا ۲۳ مارچ ۸۲ء) کے لئے ارسال کیا تھا موضوع کی مناسبت سے اس مقالے کو حکمت قرآن کے اس پہلے باقاعدہ شمارے میں شامل کیا جا رہا ہے (ادارہ)

قرآن حکیم اللہ رب العزت کی کتاب ہے۔ اس کی عظمت و بڑائی اور گہرائی و گیرائی کا اندازہ کرنے کے لئے اس کی یہ نسبت ہی کافی ہے۔ "حکمت" قرآنی علم و فہم کا نہایت اونچا درجہ ہے۔ جس پر اللہ نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو سرفراز فرمایا اور اس کی تعلیم کو نبوت کا فرض منصبی قرار دیا۔ پھر جس کو جس درجہ اور جس گوشہ میں رسول اللہ سے زیادہ مناسبت ہوئی اس کے لحاظ سے وہ حکمت کی تعلیم سے بہرہ ور ہوا۔ چنانچہ جن آیتوں میں آپ کے فرائض کا تذکرہ ہے، ان میں صلاحیتوں کی کمی بیشی کے لحاظ سے قرآنی علم و فہم کے درجوں کیطرف بھی اشارہ ہے اور حکمت کو آخری درجہ قرار دیا گیا ہے۔ مثلاً دعاء ابراہیمی میں ہے:۔

ربنا وابعث فیھم رسولا منھم یتلوا علیھم آیتک ویعلمھم الکتب والحکمۃ ویزکیھم انک انت العزیز الحکیم [1]

اے ہمارے پروردگار ان میں ایک رسول انہیں میں سے بھیجئے جو انہیں آپ کی آیتیں پڑھ کر سنائے اور انہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دے اور ان کی تربیت (تزکیہ) کرے۔ بیشک آپ غالب اور حکمت والے ہیں۔

انسان پر احسان عظیم کے ذکر میں ہے:۔

لقد من اللہ علی المومنین اذ بعث فیھم رسولاً منھم یتلوا علیھم آیتہ ویزکیھم ویعلمھم الکتب

بیشک اللہ نے مومنوں پر احسان فرمایا۔ کہ انہیں ایک رسول انہیں میں سے بھیجا جو انکو اس کی آیتیں پڑھ کر سناتا ہے۔ ان کو پاک و

---

[1] سورۂ بقرہ آیت ۱۲۹

والحکمۃ وان کانوا من قبل لفی ضلل مبین [1]

صاف (تربیت وتزکیہ) کرتا ہے۔ اور ان کو کتاب وحکمت کی تعلیم دیتا ہے۔ بلاشبہ یہ لوگ اس سے پہلے کھلی ہوئی گمراہی میں تھے۔

اللہ کی صفات بروئے کار لانے کے ذکر میں ہے

ھوالذی بعث فی الامیین رسولا منھم یتلوا علیھم آیتہ ویزکیھم ویعلمھم الکتب والحکمۃ وان کانوا من قبل لفی ضلل مبین [2]

اللہ ہی نے امیوں میں انہی میں سے ایک رسول بھیجا جو ان کو اس کی آیتیں پڑھ کر سناتا ہے اور ان کو پاک وصاف (تزکیہ وتربیت) کرتا ہے اور ان کو کتاب وحکمت کی تعلیم دیتا ہے اور بے شک یہ لوگ اس سے پہلے کھلی ہوئی گمراہی میں تھے

اوپر اللہ کی چار صفتیں ذکر کی گئی ہیں

(۱) الملک۔ وہ حقیقی فرمانروا ہے اس لئے وہ ہدایات و فرامین بھیجتا ہے۔
(۲) القدوس۔ وہ پاک وصاف ہے۔ اس لئے پاکی وصفائی (تزکیہ) کا حکم دیتا ہے۔
(۳) العزیز۔ وہ غلبہ والا ہے۔ اس لئے قانون وشریعت کی تعلیم دیتا ہے۔
(۴) الحکیم۔ وہ حکمت والا ہے۔ اس لئے وہ حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔ تاکہ اس کے ذریعہ نمو پذیر زندگی اور ترقی پذیر معاشرہ سے قانون وشریعت کا ربط قائم رہے۔

مذکورہ فرائض منصبی کی آیتوں میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ذہنی وفکری استعداد کے لحاظ سے قرآنی علم وفہم کے تین درجے ہیں۔

(۱) تلاوت آیات (ترجمہ وسرسری مطلب جان لینا) کا درجہ جو اہل عرب کو حاصل تھا۔ اور غیر اہل عرب کو بار بار ترجمہ وتفسیر دیکھتے وپڑھتے رہنے سے حاصل ہوجاتا ہے۔
(۲) تعلیم کتاب (مفہوم متعین کرکے اس کو برمحل منطبق کرلینا) کا درجہ جو سورت کے موضوع اور حالات وقرائن میں نظر ڈالتے رہنے سے حاصل ہوتا ہے۔ اسمیں عربی زباندانی کے ساتھ غور وفکر کی بڑی اہمیت ہے اور سوچنے والے دماغ ہی کو یہ درجہ

---

[1] سورۂ آل عمران آیت ۱۶۴ [2] سورۂ جمعہ آیت ۲

حاصل ہوتا ہے۔

(۳) تعلیم حکمت (گہرائی و تہہ تک پہونچنے اور اسرار و رموز سے واقفیت حاصل کرنا) کا درجہ جو انسان و سماج کے حالات اور قرآنی آیات میں مسلسل غور و فکر کرتے رہنے سے حاصل ہوتا ہے۔ اسمیں خاص قسم کی ذہنی رسائی و فکری بلندی درکار ہے۔ جو تخلیقی ذہن و فکر کے بغیر بہت کم پائی جاتی ہے۔

پہلے درجہ کا زیادہ ظہور ہدایات و فرامین اور قصص و امثال میں ہوتا ہے۔ دوسرے کا شریعت و قانون اور تیسرے کا اخذ و استنباط میں ہوتا ہے۔

ذیل میں اس درجہ کی تفصیل ذکر کی جاتی ہے۔

حکمت کی تکوین: قرآنی علم و فہم کا ہر درجہ اگرچہ شعورِ عقل و شعورِ قلب کے مجموعہ سے وجود میں آتا ہے۔ لیکن حکمت کی تکوین جس قوت سے ہوتی ہے۔ اسمیں خاص طور سے دونوں کا اعلیٰ درجہ ملحوظ ہوتا ہے۔ جو فطری ذوق و خلقی وجدان کے بغیر خاطر خواہ نتیجہ نہیں برآمد کرتا۔ عقل کی طرح قلب بھی شعور رکھتا ہے۔ اگرچہ دونوں کی نوعیت و کیفیت میں فرق ہے۔ جیسا کہ قرآن حکیم کی بہت سی آیتوں میں شعورِ قلب کو بھی سمجھ بوجھ کا ذریعہ تسلیم کیا گیا ہے۔ مثلاً :-

لھم قلوب لا یفقھون بھا [1]	انکے پاس دل ہیں جو سمجھتے نہیں ہیں۔
ام علی قلوب اقفالھا [2]	کیا ان کے دلوں پر تالے پڑے ہوئے ہیں۔
نطبع علی قلوبھم فھم لا یفقھون [3]	انکے دلوں پر اللہ نے مہر لگا دی ہے۔ وہ سمجھتے نہیں ہیں۔
ختم اللہ علی قلوبھم [4]	اللہ نے ان کے دلوں پر مہر لگا دی ہے۔

ان آیتوں میں اُس شعور سے انکار کیا گیا ہے جس کا تعلق قلب سے ہے۔ شعورِ عقل سے انکار نہیں کیا گیا۔

حکمت کی تکوین میں اعلیٰ درجہ کے مجموعہ کی جھلک اس کی تعریف، تعبیر، تشریح اور شرائط و آداب ہر ایک میں دکھائی دیتی ہے۔ مثلاً

---

[1] سورۂ اعراف آیت ۱۷۹ [2] محمد آیت ۲۴ [3] منافقون آیت ۳ [4] بقرہ آیت ۷

حکمت کی تعریف

تعریف یہ ہے

ھی اسم القوۃ الجامعۃ لرزانۃ العقل والرای وشرافۃ الخلق الناشئۃ منھا [1]	حکمت ایسی قوت کا نام ہے جو عقل و رائے کی پختگی اور اس سے نشو و نما پانے والی اخلاقی شرافت کو جامع ہے

اس تعریف کی تائید قرآن حکیم کی اُن متعدد آیتوں سے ہوتی ہے جن میں انبیاء علیہم السلام کو حکمت دیئے جانے کا ذکر ہے۔ لیکن حضرت داؤد علیہ السلام کے واقعہ میں حکمت کا ایک اہم اثر و نتیجہ بھی ذکر کیا گیا ہے۔ چنانچہ

وآتیناہ الحکمۃ وفصل الخطاب [2] فصل الخطاب سے مراد	ہم نے داؤدؑ کو حکمت و فیصلہ کُن بات دی
وھو القول الحق الواضح عند العقل والقلب [3]	وہ حق بات جو عقل و قلب دونوں کے نزدیک واضح ہو۔

جس طرح قولِ فیصل حکمت کے آثار میں سے ہے۔ اسی طرح اخلاق کی پاکیزگی اور حسنِ ادب بھی اس کے آثار میں سے ہے۔

حکمت کی تعبیر

حکمت کی تعبیر شرح صدر، القاءِ ربانی، علم لدنی اور نور وغیرہ الفاظ سے کی جاتی ہے۔ مثلاً

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شرح صدر کے بارے میں ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے فرمایا:۔

ھو نور یقذفہ اللہ فی القلب [4]	وہ ایک نور ہے جس کو اللہ تعالیٰ سینہ میں ڈالتا ہے۔

امام مالکؒ کے اس قول سے مزید وضاحت ہوتی ہے:۔

الحکمۃ والعلم نور یھدی بہ اللہ	حکمت اور علم نور ہے اللہ جس کو چاہتا ہے

---

[1] المعلم عبدالحمید فراہی مفردات القرآن [2] آیت ۲۰ [3] عبدالحمید فراہی مفردات القرآن
[4] الغزالی المنقذ من الضلال

من يشاء وليس بكثرة المسائل[1] — اس کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ وہ زیادہ مسائل جاننے کا نام نہیں ہے

امام غزالیؒ نے اس نور کو "مفتاح" سے تعبیر کیا ہے

وذالك النور وهو مفتاح اكثر المعارف[2] — یہ نور اکثر معارف کی کنجی ہے

حکمت کی تشریح

حکمت کی تشریح دینی معرفت، دینی عقل، گہری سمجھ، فقہ، نفسی ملکہ، علم اسرار دین، علم و عمل، قول صواب و فعل صحیح وغیرہ سے کیجاتی ہے۔ جو بجائے خود اس کی ماہیت کی طرف اشارہ کرتے ہیں اور اس بات کا ثبوت فراہم کرتے ہیں کہ اس کی تکوین میں شعورِ عقل و قلب کے اعلیٰ مجموعہ کے ساتھ فطری ذوق و خلقی وجدان کو بھی دخل ہے جو عطیۂ ربانی و فضل ایزدی ہے۔ جیسا کہ اس کی تائید ان تشریحات سے ہوتی ہے۔

ائمہ لغت نے اس کی تشریح یوں کی ہے

الحكمة اصابة الحق بالعلم والعقل[3] — علم و عقل کے ذریعے حق تک پہونچنے کا نام حکمت ہے۔

الحكمة عبارة عن معرفة افضل الاشياء بافضل العلوم[4] — افضل اور بہتر چیز کو بہترین علم کے ذریعہ جاننا حکمت ہے۔

مفسرین سے یہ تشریح منقول ہے:۔

وضع كل شيئ موضعه، — ہر شے کو اس کے مناسب محل میں رکھنا،

معرفة الاشياء بحقائقها، — حقائق اشیاء کی معرفت،

الفصل بين الحق والباطل، — حق و باطل کے درمیان فیصلہ کی قوت،

الاصابة فى القول والعمل[5]، — قول و عمل میں صحیح رائے تک پہونچنا،

---

[1] ابن عبدالبر: جامع بيان العلم وفضله قوله لاحسد الا فى اثنين [2] غزالی المنقذ من الضلال ص٣ [3] راغب اصفهانی: المفردات فى غريب القرآن [4] محمد بن مکرم انصاری: لسان العرب [5] علاء الدين على تفسير خازن ص٨٦ و تفسير ... تفسير مظهرى ...

ما یکمل نفوسھم من المعارف و الاحکام — وہ معارف واحکام جن سے نفوس انسانی کمال کو پہونچیں۔

ان کے علاوہ بھی بہت سی تشریحات مفسرین سے منقول ہیں مثلاً

انوار قلوب کی معرفت اور اسرار عیوب سے واقفیت، نفس اور شیطان کی دقیقہ رسی سے آگاہی۔ شیطانی اور انسانی تقاضوں میں امتیاز کی قوت، عقل کی رہنمائی اور قلب کی بصیرت برائیوں کی صحیح نشاندہی کے بعد علاج کی صحیح تدبیریں مخلوق کے احوال کا علم، خاص قسم کی فراست[1]

مجاہد تابعیؒ اور امام مالکؒ سے یہ تشریح منقول ہے۔

انما معرفۃ الحق والعمل بہ والاصابۃ فی القول والعمل[2] — حق کی معرفت اس پر عمل اور قول وعمل میں درستی کو پہونچنے کا نام حکمت ہے۔

ابن قیمؒ نے اس کو احسن کہا ہے

واحسن ما قیل فی الحکمۃ[3] — حکمت کے باب میں جو کچھ کہا گیا اس میں یہ احسن ہے۔

ابن مسکویہؒ نے حکمت کے تحت یہ چیزیں بیان کی ہیں

"ذکاوت و ذہانت، سرعت فہم، ذہن کی صفائی، عقل کی رسائی اور سہولت تعلم"

پھر اس کے بعد کہا ہے

وبھذہ الاشیاء یکون حسن الاستعداد للحکمۃ[4] — ان ہی چیزوں کے ذریعہ حکمت کی حسن استعداد پیدا ہوتی ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہؒ سے یہ تشریح منقول ہے۔ ھو علم اسرار الدین الباحث عن حکم الاحکام ولمیاتھا واسرار خواص الاعمال ونکاتھا[5] وہ اسرار دین کا علم ہے جو احکام کی لم اور علت سے بحث کرتا ہے اور اعمال کے خواص و باریکیوں تک پہونچاتا ہے۔

---

[1] عرائس فی حقائق القرآن ص۲۱ [2] ابن القیمؒ: مدارج السالکین وتفسیر قیم و انزل اللہ ...... الخ [3] ایضاً [4] تہذیب اخلاق ص۳ [5] شاہ ولی اللہ: حجۃ اللہ البالغہ مقدمہ ص۳

پھر اس پر قابو پانے کے لئے ذہنی رسائی و فکری بلندی کا ذکر اس طرح کیا ہے ۔

وَقَادالطبیعة سیال القریحہ[1] — روشن دماغ اور رسا ذہن ہو ۔

وقّاد اور سیّال دونوں مبالغے کے صیغے ہیں جن کی افادیت تخلیقی صلاحیت تک پہنچتی ہے ۔ مذکورہ تعبیر و تشریح کے الفاظ میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اصلاً یہ سب ایک ہی حقیقت کو واضح کرنے والے اور ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم ہیں۔ فرق صرف الفاظ کے انتخاب میں ہے ۔ کسی نے شعور قلب کی مناسبت کو ملحوظ رکھا۔ کسی نے شعورِ عقل کی مناسبت کو اور کسی نے عقل و قلب دونوں کے شعور کا لحاظ کیا ۔

حکمت کے شرائط :- قرانی حکمت کے شرائط میں تزکیۂ نفس اور فکرِ آخرت کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ تزکیہ میں عقائد و خیالات کی صفائی اور اعمال و اخلاق کی درستی دونوں شامل ہیں یعنی غلط نظریات و عقائد سے شیشۂ دل و آئینہ دماغ کی صفائی کر کے صحیح اصول و نظریات ان کی جگہ بٹھائے جائیں ۔اسی طرح بُرے اخلاق و گندے اعمال سے ہٹا کر اچھے اعمال و عمدہ اخلاق کا خوگر بنایا جائے ۔ اس طرح تزکیہ کے ذریعے لازمی طور سے عقل و قلب کی فطری صلاحیتوں کو نشو و نما پانے کا موقع ملے گا۔ جس کی بنیاد پر لغت کے ماہرین نے اس کے معنی ہی "ابھارنا اور نشو و نما دینا" کئے ہیں ۔چنانچہ مذکورہ فرائض منصبی کی آیتوں میں لفظ ویزکیھم (اللہ کا رسولؐ انکا تزکیہ کرتا ہے) بھی ہے جس کا مادہ زکاءٌ ہے ۔

الزکاء النماء والسریع[2] — زکاء کے معنی بڑھنا اور تر و تازہ ہونا

اصل الزکاۃ النمو الحاصل عن برکۃ اللہ[3] — زکاء کی اصل وہ بڑھوتری ہے جو اللہ کی برکت سے حاصل ہو ۔

یہ لفظ سورۂ آل عمران آیت ۱۶۴ اور سورۂ جمعہ آیت ۲ میں علم و فہم کے پہلے درجہ (تلاوت آیات) کے بعد ہے جس سے یہ ثابت ہوتی ہے کہ تزکیہ قرانی علم و فہم کے ہر درجہ میں مطلوب ہے ۔لیکن سورۂ بقرہ آیت ۱۲۹ (دعاء ابراہیمی) میں علم و فہم کے آخری درجہ (حکمت) کے بعد ہے ۔جس سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ دعا و درخواست کے موقع پہ کام کی ترتیب

---

[1] شاہ ولی اللہ: حجۃ اللہ البالغہ مقدمہ ص۳ [2] محمد بن مکرم انصاری (ابن منظور) لسان العرب ج ۱۴ [3] راغب اصفہانی: المفردات فی غریب القرآن

نہیں ملحوظ ہوتی صرف تفصیل ملحوظ ہوتی ہے۔ جبکہ قبولیت واجابت کا موقع اس کا پابند ہوتا ہے کہ مسائل کی مصلحت کے پیش نظر کام کی ترتیب ملحوظ رکھے۔

حکمت چونکہ علم وفہم کا نہایت اونچا درجہ ہے۔ اس بنا پر لازمی طور سے اس کے لئے خاص تزکیہ مطلوب ہے جو ذہنی وفکری آبگینہ میں وہ چمک پیدا کردے جو قرآنی حکمت کے لئے درکار ہے۔ یہ خاص تزکیہ عام حالات میں نہیں تکمیل کو پہونچتا۔ بلکہ اس کے لئے کچھ خاص حالات (جو افراد واشخاص کے لحاظ سے مختلف ہوتے ہیں) ہوتے ہیں۔ جن کے ذریعے یہ تکمیل کو پہونچتا ہے۔ ثبوت میں حضرات انبیاء علیہم السلام و دیگر صاحب حکمت کی زندگیاں پیش کی جاسکتی ہیں۔

فکر آخرت کے ذریعے قوت حکمت کا رشتہ سرچشمہ حکمت (اللہ رب العزت) سے قائم ہوتا اور نورانی دنیا سے ربط وتعلق پیدا ہوتا ہے۔ پھر ادھر سے علم وعرفان اور فیوض وبرکات کا سلسلہ جاری ہوجاتا ہے۔

جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

ما زهد عبد فی الدنیا الا انبت اللہ الحکمة فی قلبه [۱]	جس بندے نے دنیا میں زہد اختیار کیا (بے رغبت رہا) تو اللہ تعالیٰ اس کے دل میں حکمت اگائے گا۔

دوسری جگہ ہے۔

اذا رائیتم العبد یعطی زهدا فی الدنیا وقلة منطق فاقتربوا منه فانه یلقی الحکمة [۲]	جب کسی بندہ کو دیکھو کہ اس کو دنیا میں زہد (بے رغبتی) عطا کیا گیا اور بولنا کم ہے تو اسکی صحبت اختیار کرو کہ اسمیں حکمت کا القاء ہوتا ہے۔

ایک اور موقعہ پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سینہ میں نور داخل ہونے کی یہ علامت بیان فرمائی

التجافی عن دار الغرور والانابة الی	دار الغرور (دنیا) سے الگ رہنا (دل نہ

---

[۱] مشکوٰۃ کتاب الرقاق

دارالخلود والاستعداد للموت قبل نزوله [1] — لگانا) دارالخلود (آخرت) کی طرف متوجہ رہنا اور موت سے پہلے اس کی تیاری کرنا۔

حکمت کے آداب: قرآنی حکمت کے آداب میں اللہ کے بندوں کے ساتھ محبت وشفقت کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ اس میں صبر وضبط، سخاوت وقناعت، نرم دلی ودلسوزی اور ایثار وقربانی وغیرہ اوصاف شامل ہیں جیسا کہ قرآن حکیم میں ہے۔

یؤتی الحکمۃ من یشاء ومن یؤت الحکمۃ فقد اوتی خیرا کثیرا [2] — اللہ جس کو چاہتا ہے حکمت عطا کرتا ہے اور جس کو حکمت عطا ہوئی وہ خیر کثیر سے نوازا گیا۔

یہ آیت بندوں پر خرچ کرنے اور اس راہ کی شیطانی وساوس سے بچنے کی تاکید کے بعد ہے۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کا اثر ونتیجہ عطیۂ حکمت کی شکل میں بھی نمایاں ہوتا ہے۔

اسی طرح حکمت کے آداب میں ان اوصاف ذمیمہ سے بچنا ہے جو قساوت قلبی پیدا کرتے ہیں مثلاً کبر ونفاق، بغض وحسد، غیبت وبرائی، حرص وطمع وغیرہ جیسا کہ قرآن وحدیث میں ان کے جو اثرات بیان ہوئے ہیں۔ ان سے اس کا ثبوت ملتا ہے۔

حکمت کے استعمال میں فرق: مذکورہ تفصیل سے یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ قرآنی حکمت کا مفہوم اردو کے مفہوم سے کہیں زیادہ بلند ہے۔ کیونکہ اس کے لئے شعور کی مروجہ انسانی تصور سے کچھ اونچی سطح درکار ہے۔ جبکہ اردو میں شعور وعقل کا اونچا درجہ کفایت کرتا ہے۔ پھر اردو میں وہ فراست ملحوظ نہیں ہوتی جو شعور کے تزکیہ کی راہ سے آتی ہے۔ اور آداب کی بجاآوری سے اس کی قوت پرواز میں اضافہ ہوتا ہے۔ جبکہ اس میں ان دونوں کو خصوصی مقام حاصل ہے

حکمت کے میدان کا دائرۂ کار: قرآنی حکمت کی تکوین میں اگرچہ شعور عقل وقلب کا اعلیٰ مجموعہ ہوتا ہے۔ لیکن دیگر نفسی قوتوں اور باہمی مناسبتوں کو سامنے رکھ کر قدرت جس (عقل یا قلب کے شعور) کو زیادہ ابھارتی اور جس سے متعلق کام

---

[1] مشکوٰۃ کتاب الرقاق [2] سورہ البقرہ آیت ۲۶۹

کے زیادہ مواقع فراہم کرتی ہے پس اس کے لحاظ سے حکمت کے میدان کا دائرہ کار متعین ہوتا ہے۔ اور کام کی راہیں ہموار ہوتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ عارفین اور راسخین (علم میں) دونوں میں حکمت کی قوت موجود ہوتی ہے۔ لیکن عارفین کا میدان شعور قلب سے زیادہ تعلق رکھتا ہے جبکہ راسخین کا میدان شعور عقل سے زیادہ تعلق رکھتا ہے۔

چنانچہ راسخین کی حکمت علم کے میدان میں زیادہ نمایاں ہوتی ہے۔ جبکہ عارفین کی حکمت تزکیہ کے میدان میں کارہائے نمایاں انجام دیتی ہے اور یہ واقعہ ہے کہ ہر ایک کی بات اپنے اپنے میدان و دائرہ ہی میں زیادہ وزن دار بنتی ہے۔

حکمت کے سب سے اونچے اور جامع درجہ پر رسول اللہ فائز تھے

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قرآنی حکمت کے سب سے اونچے درجہ پر فائز اور ہر میدان و دائرہ کے جامع تھے اور بڑی بات یہ کہ سب میں توازن برقرار رکھے ہوئے تھے۔ جس کی بنا پر ہر میدان و دائرہ کی بات وزن دار اور افراط و تفریط سے پاک تھی۔

قرآن حکیم میں اس کی تعبیر اس طرح ہے۔

انا انزلنا الیک الکتاب بالحق لتحکم بین الناس بما اراک اللہ[1]	اے نبیؐ! ہم نے آپ کی طرف حق کے ساتھ کتاب اتاری تاکہ آپ لوگوں کے درمیان اس کے مطابق فیصلہ کریں جو اللہ نے آپ کو دکھایا

مااراک اللہ (جو اللہ نے آپ کو دکھایا) اصلاً شعورِ نبوت ہے[2] جس کے تکوینی اجزا میں کمالِ حکمت کی قوت شامل ہے۔

خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کئی مقام پر یہی تعبیر اختیار فرمائی ہے انی اری مالاترون[3]۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس قوت کی حفاظت و نگرانی ہوتی تھی۔

---

[1] سورۂ نساء آیت ۱۰۵ [2] شعورِ نبوت کی تفصیل کے لئے راقم الحروف کی کتاب "حدیث کا درایتی معیار" دیکھئے [3] ترمذی و ابن ماجہ ابواب الزھد

واصبر لحکم ربك فانك باعيننا [1]
آپ اپنے رب کے حکم کا انتظار کیجئے۔ آپ ہماری نگاہوں کے سامنے ہیں۔

ولولا ان ثبتنك لقد كدت تركن اليهم شيئا قليلا [2]
اگر ہم آپ کو ثابت قدم نہ رکھتے تو آپ کچھ ان کی طرف مائل ہو جاتے

اسی بنا پر حضرت عمرؓ نے فرمایا:-

ويقولن قضيت بما ارٰنی اللہ تعالٰی فان اللہ تعالٰی لم يجعل ذالك الا لنبيه واما احدنا فرايه يكون ظنا لا علما [3]
کوئی شخص یہ نہ کہے کہ میں نے اس کے مطابق فیصلہ کیا جو اللہ نے مجھے دکھایا۔ کیونکہ یہ مقام صرف نبیؐ کے لئے خاص ہے۔ ہم لوگوں کی رائے ظن کے درجہ میں ہوتی ہے نہ کہ علم کے درجہ میں۔

امام فخرالدین رازی نے مذکورہ آیت میں علم کو رویت سے تعبیر کی یہ وجہ بیان کی ہے۔

لان العلم اليقيني المبرا عن جهات الريب يكون جاريا مجرى الرويه في القوة والظهور [4]
وہ علم یقینی جو شک کو دور کرنیوالا ہے قوت اور ظہور میں رویت (دیکھنے) کے قائم مقام ہوتا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قوت حکمت چونکہ ان اوصاف کے ساتھ متصف ہے۔ اس بنا پر قرآنی حکمت میں اس کو معیار اور سند کا درجہ حاصل ہے۔ کسی اور کی قوت کو یہ درجہ حاصل نہیں ہے۔ غالباً اسی بنا پر امام شافعیؒ وغیرہ نے مذکورہ فرائض منصبی کی آیات (ويعلمهم الكتب والحكمة) میں حکمت کی تفسیر سنت نبویؐ کی ہے۔ ابن قیمؒ کہتے ہیں:-

واما الحكمة المقرونة بالكتاب فهى السنه كذالك قال الشافعى وغيره من الائمه [1]
جو حکمت کتاب کے ساتھ مذکور ہے اس سے مراد سنت ہے۔ امام شافعیؒ اور دوسرے اماموں نے یہی کہا ہے۔

---

[1] سورہ طور آیت ۴۸ [2] سورۂ بنی اسرائیل آیت ۷۴ [3] فخرالدین رازی تفسیر کبیر جز ثالث نساء آیت ۷۴ ومحمد عبدہ مصری تفسیر المنار جز خامس نساء آیت ۷۴ [4] فخرالدین رازی تفسیر کبیر جز ثالث نساء آیت ۷۴

جس کا مطلب یہ ہے کہ قرآنی حکمت کا اولین مظہر بطور نمونہ سنت نبوی ہے کہ اس کو معیار بنا کر قوت حکمت کے ذریعہ اخذ و استنباط کا سلسلہ جاری رہے اور اس کے ذریعہ نمو پذیر زندگی و ترقی پذیر معاشرہ کی رہنمائی ہوتی رہے۔ یہ مطلب نہیں کہ قرآنی حکمت تمام تر سنت نبوی ہے کہ اس کے بعد غور و فکر اور اخذ و استنباط کا دروازہ بند ہو گیا ہے۔ یہ قرآن حکیم کی آیت کے خلاف ہے۔

وانزلنا الیك الذکر لتبین للناس ما نزل الیھم ولعلھم یتفکرون[۱]

ہم نے آپؐ پر الذکر (قرآن) اتارا کہ جو لوگوں کی طرف بھیجا گیا ہے۔ آپؐ ان کے سامنے بیان کر دیں تاکہ وہ خود غور و فکر کریں۔

"لعلھم یتفکرون" کے ذریعہ ایسے تمام لوگوں کو غور و فکر کی دعوت دی گئی ہے جو اس کی صلاحیت رکھتے اور اخذ و استنباط کر سکتے ہیں۔

پھر محققین کے نزدیک اخذ و استنباط کے لحاظ سے کسی بھی موضوع سے متعلق قرآنی آیتوں کی مقدار حقیقی نہیں بلکہ اضافی ہے۔ جو ذہنوں اور طبیعتوں نیز حالتوں اور ضرورتوں کے لحاظ سے مقدار میں تبدیلی ہوتی رہتی ہے۔ ابن دقیق العید کہتے ہیں

مقدار آیات الاحکام لاتنحصر فی ھذا العدد بل ھو یختلف باختلاف القرائح والاذھان وما یفتحه الله من وجوه الاستنباط ولمن رسخ فی علوم الشریعة یعرف ان من اصولها واحکامها ما یوخذ من موارد متعددة حتی الآیات الواردة فی القصص والامثال[۲]

آیات احکام کی مقدار اس عدد (دو سو یا پانچ سو یا کچھ زیادہ) میں محدود نہیں ہے بلکہ طبیعتوں اور ذہنوں کے اختلاف سے مقدار مختلف ہوتی ہے۔ جن حضرات پر اللہ نے وجوہ استنباط کے دروازے کھولے اور جنکو علوم شرعیہ میں رسوخ حاصل ہے وہ جانتے ہیں کہ بہت سے اصول و احکام متعدد جگہوں سے حاصل ہوتے ہیں حتی کہ ان آیتوں سے بھی جو قصص و امثال میں وارد ہوئی ہیں۔

---

[۱] ابن قیم مدارج السالکین وتفسیر قیم وانزل الله علیك الکتب والحکمة آیت ... آیت ۴۴ [۲] علال فاسی مقاصد الشریعة الاسلامیة القرآن

حکمت کے درجات: حکمت کے بہت سے درجے اور مرتبے ہیں جو جس درجہ اور جس گوشہ میں اس کی قوت رکھتا ہے۔ اسی کی مناسبت سے وہ درجہ حکمت پر فائز ہوتا ہے۔ جیسا کہ قرآنِ حکیم میں ہے۔

یؤتی حکمۃ من یشاء ومن یؤت حکمۃ فقد اوتی خیراً کثیراً[1]	اللہ جس کو چاہتا ہے حکمت عطا کرتا ہے اور جس کو حکمت عطا ہوئی وہ "خیر کثیر" سے نوازا گیا۔

اور حدیث لکل حدٍ مطلع[2] (ہر حد کے لئے واقفیت کے مقام ہیں) میں غالباً درجات کی طرف اشارہ ہے۔ کیونکہ "مطلع" اس روشندان کو کہتے ہیں جو بلندی پر ہوتا اور جس کے ذریعہ چیزوں سے واقفیت حاصل کی جاتی ہے اسی طرح حکمت کے ذریعہ بلندی پر پہنچ کر اور متعلقہ چیزوں سے واقفیت حاصل کر کے گہرائی تک رسائی حاصل کی جاتی اور پھر سارے پہلوؤں کو سامنے رکھ کر مبصرانہ حیثیت سے گفتگو ہوتی ہے۔

حکمت کی تکوین چونکہ شعور عقل اور شعور قلب کے مجموعہ سے ہوتی ہے اور دونوں طبعی خصوصیات و بشری کمزوریوں سے خالص و بے آمیز نہیں ہوتے ہیں۔ اس بنا پر قوت حکمت کو اپنی رہنمائی کے لئے ایک بلند و برتر شعور کی ضرورت ہے کہ جس کے ذریعے اپنے فیصلہ و نتائج میں نکھار و جلاء پیدا کر سکے اور جس کا دامن عصمت اس کے لئے ذریعہ نجات بن سکے۔ یہ رہنما شعور نبوت ہے کہ انسانوں کی دنیا میں اس سے زیادہ کسی اور کے خالص و بے آمیز ہونے کی ضمانت نہیں ملتی۔ اس شعور سے رہنمائی حاصل کرنے کا براہ راست سلسلہ ختم نبوت کے ساتھ اگرچہ ختم ہو گیا لیکن اس سے حاصل شدہ علم و حکمت کی دونوں قسمیں موجود و محفوظ ہیں۔

(۱) وہ علم و حکمت جو برتر شعور یا نور سے تعلق جوڑ کر حاصل کیا گیا۔ جس کا تعلق خارجی و ماورائی حقیقت سے ہے۔ اس کا اصطلاحی نام "قرآن" ہے۔ والقرآن یفسر بعضہ بعضاً (قرآن کا ایک حصہ خود دوسرے حصے کی تفسیر کرتا ہے)

(۲) وہ علم و حکمت جو نبوت کے خلقی وجدان و داخلی شعور کا نتیجہ اور قرآن کی معنوی دلالت سے حاصل کیا ہوا ہے اس کا اصطلاحی نام حدیث و سنت ہے۔

---

[1] سورہ بقرہ آیت ۲۶۹ [2] مشکوٰۃ کتاب العلم

شعورِ نبوّت کو رہنما بنانے کی ضرورت اس لئے بھی ہے کہ حکمت میں خفا ہوتا ہے اس کا انضباط مشکل ہوتا ہے اور اس کے لئے قلب و دماغ کے آبگینہ کی خاص چمک درکار ہوتی ہے۔ جو سخت مرحلات و ریاضات کے بعد ہی نمودار ہوتی ہے۔ ایسی حالت میں توازن برقرار رکھنے کے لئے کسی برتر شعور کی رہنمائی قبول کئے بغیر چارہ نہیں ہے۔

اس رہنمائی کی ضرورت راسخین (علم میں) اور عارفین سبھی کو ہے۔ جس کے ذریعہ ہر ایک کی حکمت اپنی چاک دامنی کے لئے رفوگری کا سامان مہیا کر کے فائز المرام ہوگی اور جس کسی کی حکمت سے اس پر زد پڑتی ہوگی۔ وہ قرآنی حکمت کہلانے کی مستحق نہ قرار پائے گی۔ خواہ وہ بڑے سے بڑے راسخ فی العلم اور عارف باللہ کی حکمت ہی کیوں نہ ہو۔

قرآن حکیم

کی

سورتوں کا اجمالی تجزیہ

(سورۃ الفاتحہ تا سورۃ الکہف)

فہم قرآن کیلئے ایک کلید!

ڈاکٹر اسرار احمد

کی نشری تقاریر پر مبنی ایک اہم تصنیف

اعلیٰ سفید کاغذ، عمدہ کتابت اور دیدہ زیب طباعت

ہدیہ : -/۸ روپے

شعورِ نبوّت کو رہنما بنانے کی ضرورت اس لئے بھی ہے کہ حکمت میں خفا ہوتا ہے اس کا انضباط مشکل ہوتا ہے اور اس کے لئے قلب و دماغ کے آبگینہ کی خاص چمک درکار ہوتی ہے۔ جو سخت مرحلات و ریاضات کے بعد ہی نمودار ہوتی ہے۔ ایسی حالت میں توازن برقرار رکھنے کے لئے کسی برتر شعور کی رہنمائی قبول کئے بغیر چارہ نہیں ہے۔

اس رہنمائی کی ضرورت راسخین (علم میں) اور عارفین سبھی کو ہے۔ جس کے ذریعہ ہر ایک کی حکمت اپنی چاک دامنی کے لئے رفوگری کا سامان مہیا کر کے فائز المرام ہوگی اور جس کسی کی حکمت سے اس پر زد پڑتی ہوگی۔ وہ قرآنی حکمت کہلانے کی مستحق نہ قرار پائے گی۔ خواہ وہ بڑے سے بڑے راسخ فی العلم اور عارف باللہ کی حکمت ہی کیوں نہ ہو۔

قرآنِ حکیم
کی
سُورتوں کا اجمالی تجزیہ
(سُورۃ الفاتحہ تا سُورۃ الکہف)

فہم قرآن کیلئے ایک کلید!

ڈاکٹر اسرار احمد
کی نشری تقاریر پر مبنی ایک اہم تصنیف

اعلیٰ سفید کاغذ، عمدہ کتابت اور دیدہ زیب طباعت

ہدیہ : -/۸ روپے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قرآن کریم اور ضمیر بیدار

تحریر :- حافظ احمد یار
شعبہ علوم اسلامیہ پنجاب یونیورسٹی ، لاہور

حمد وصلوٰۃ کے بعد ۔ ۔ ۔ ۔ ”اِنْ کُلُّ نَفْسٍ لَّمَّا عَلَیْھَا حَافِظٌ“

انسان کو اللہ تعالےٰ نے جن باطنی قوتوں سے نوازا ہے ان میں سے دل ودماغ یا عقل وضمیر دو نہایت اہم قوتیں ہیں — جس طرح بیرونی حواس کا فقدان یا ان کی صحت وسقم انسان کی مادی زندگی پر اثر انداز ہوتے ہیں - اسی طرح انسان کی ان اندرونی طاقتوں کی صحت وقوت یا ان کا فساد وضعف اس کی اخلاقی وروحانی زندگی پر بھی اثر انداز ہوتا ہے اور بالآخر اس کی اُخروی زندگی میں سعادت وشقاوت اور فلاح یا خسارہ کا باعث بنتا ہے — ہمارا آج کا موضوع لفظ ”ضمیر“ اگرچہ عربی زبان ہی کا لفظ ہے جو انسان کی باطنی وقلبی کیفیت اور داخلی شعور کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے تاہم قرآن کریم میں یہ لفظ کہیں استعمال نہیں ہوا — اردو اور عربی میں اب یہ لفظ ”ضمیر“ عام طور پر انگریزی لفظ 'Conscience' کے لئے استعمال ہونے لگا ہے — جو انسان کی ایک اہم باطنی کیفیت یا قلبی استعداد FACULTY OF MIND —— بلکہ Highest Faculty of Mind کے طور پر فلسفہ ونفسیات والوں کا ایک خاص موضوع ہے — عموماً اسے ایک ایسی اندرونی استعداد یا قوت سمجھا جاتا ہے جو بصورت صحت خود انسانی حواس واحساسات اور ہیجانات کے زیر اثر رونما ہونے والی کمزوریوں پر قابو پانے کی صلاحیت رکھتی ہے جنہیں اصطلاحاً Temptation کہا جاتا ہے — نفسیات والوں کے نزدیک ہر دو (یعنی) Conscience اور Temptation انسان کی شعوری خواہشات اور غیر شعوری

محرکات کے درمیان ایک کشمکش کے دو مظاہر ہیں ـــــ مسیحی عقائد کے مطابق ضمیر کو 'Voice of God within human soul' کہا گیا ہے - ایک حدیث شریف میں بیان کردہ ایک مثال میں بھی "واعظ اللہ فی قلب کل مومن" کہہ کر اسی باطنی قوت یعنی ضمیر کی طرف اشارہ کیا گیا ہے

بہرحال یہ ایک حقیقت ہے کہ انسان کے اندر اخلاقی بصیرت کی ایک جبلّی استعداد بھی رکھی گئی ہے ـــــ عملی انحراف و فساد کے باوجود ـــــ اور گمراہی کی استثنائی کیفیات کے سوا ـــــ انسان کے اندر نیکی یا فضیلت کے بارے میں ایک اعتراف یا محبت اور برائی یا رذیلت کے بارے میں کے بارے میں نفرت پائی جاتی ہے ـــــــــــــــــ دوسروں کو برا کام کرتے دیکھ کر اسے دکھ ہوتا ہے اور وہ خود بھی اپنے ذاتی اخلاقی عیوب کو ناپسند کرتا ہے - اور اگر کسی ایسی چیز کا مرتکب ہوتا ہے تو یا تو اسے چھپاتا ہے۔ یا اس پر اسے سخت ندامت ہوتی ہے - یا پھر عقل کی مدد سے اس کے لئے جواز تلاش کرتا ہے - (بل الانسان علی نفسہ بصیرۃ ولو القی معاذیرہ) کوئی آدمی اپنے آپ کو جھوٹا خائن اور دغاباز کہلانا آخر کیوں پسند نہیں کرتا -

قرآن کریم بالعموم اپنے اخلاقی نظام کی بنیاد خیر و شر اور عدل و ظلم کے درمیان تمیز کرسکنے والے اسی عام انسانی شعور پر رکھتا ہے - اور عملی ہدایات دیتے وقت ان (قدروں) کے فہم کے بارے میں انسان کی اسی باطنی حس پر اعتماد کرتا ہے - معروف، منکر، عدل، احسان، فحشاء، امانت اور خیانت وغیرہ کی شرعی وضاحت کے ساتھ ساتھ قرآن کریم میں چالیس سے زیادہ مقامات پر خیر و شر کی تمیز کے بارے میں انسان کے اس اخلاقی ضمیر اور اسی اندرونی حس پر زور دیا گیا ہے - اور یہی وہ حس یا ضمیر ہے جو انسان کے قلب و دماغ اعضا و جوارح کے اعمال میں ہم آہنگی نہ پائے جانے پر ٹھیک اسی طرح مضطرب ہوتا ہے جس طرح انسانی اعصاب کسی جسمانی اذیت سے متاثر ہوتے ہیں -

ـــــــــ قرآن کریم میں اس انسانی استعداد کا ذکر مختلف ناموں سے کیا گیا ہے - غالباً سب سے نمایاں بیان اس کا "نفس لوّامہ" کے نام سے کیا گیا

ہے۔ سورۃ القیامۃ میں اسی نفس لوّامہ یا انسان کے اخلاقی ضمیر کو زندگی بعد از موت کی شہادت اور دلیلِ صداقت کے طور پر پیش کیا گیا ہے ۔ــــــ مفسّرین نے قیامت اور نفسِ لوّامہ میں مناسبت اور باہمی تعلق پر بعض عمدہ نکات اور نفسِ لوّامہ کے معنی مُراد کے بارے میں جو مختلف اقوال بیان کئے ہیں ۔ ان میں اکثر نے اسے ضمیرِ انسان کے ہم معنی بھی قرار دیا ہے ۔ ــــــ

مثلاً رازی نے ایک معنی ــ "النفس الشریفۃ التی لا تزال تلوم نفسھا" کیا ہے ۔ طبرسی نے ایک مفہوم ـــ النفس المؤمنۃ التی تلوم نفسھا فی الدنیا وتحاسبھا" بیان کیا ہے ــــــ رُوح المعانی میں ایک قول یوں بھی بیان ہوا ہے ــــــ ھی التی تنورت بنور القلب فکلما صدر عنھا سیئۃ بحکم جبلتھا الظلمانیۃ اخذت تلوم نفسھا ونفرت عنھا ۔

ــــــ لوّامہ (بار بار ندامت دلانے والا) کے صیغۂ مبالغہ میں جو ایک اعادہ و تکرار کا مفہوم ہے وہ بھی اسی دنیا میں ضمیر کا عمل مراد لئے جانے پر ایک مزید دلیل ہے ۔

ــــــ بعض مفسرین نے "ان کل نفس لما علیھا حافظ" کی تفسیر میں اس "حافظ" کے معانی میں انسان کی اس باطنی استعداد اور تمیزِ خیر و شر کی طرف بھی اشارہ کیا ہے (رُوح المعانی)

ایک مؤلف نے ابن درید کی کتاب الاشتقاق کے حوالے سے "مسلم" کے معنی میں یہ بات لکھی ہے کہ "اشتقاق المسلم من قولھم اسلمت للہ ای سلم لہ ضمیری ای خلص : ہے ـــ ابن درید کی اس تعریف میں اسلام اور ضمیر کے تعلق کے اس ذکر سے یہ بات بھی ذہن میں آتی ہے کہ خود ضمیر حق و باطل کا معیار ہرگز نہیں ۔ تاہم اسے حق و باطل کا جو معیار دے دیا جائے ۔ تو پھر وہ انسان کے ظاہر و باطن میں اس معیار کے تضاد پر مضطرب اور بے چین ہو جاتا ہے ۔ اور انسان کو ایسے رویہ پر ٹوکتا ہے ــ

یہ نفس لوامہ یا ضمیرِ حافظ یا اخلاقی بصیرت ایک زبردست قوت ہے مگر اس کی مثال کمپیوٹر کی سی ہے جو مطلوبہ جواب فوراً دیتا ہے مگر Feeded

Data کے مطابق — نیکی و بدی کا جو تصور ضمیر کو Feed کر دیا جائے۔ تو وہ اس کے مطابق بوقت ضرورت آناً فاناً نیکی یا بدی کے بارے میں سگنل دے گا۔

ضمیر کے اندر نیکی بدی کا یہ تصور یا مواد (Data) مختلف ذرائع سے بہم پہنچایا جاتا ہے — جس کا سب سے اعلیٰ اور درست ذریعہ تعلیماتِ رسالت ہیں — حواس ظاہری کی طرح انسان کی یہ باطنی قوت (ضمیر) بھی اپنی قوت و فعالیت میں یکساں نہیں رہتی کہ انسان کے کردار کو ہمیشہ اپنا پابند بنا سکے۔ اس لئے اس کے ساتھ ہی اس استعداد کی تقویت یا تربیت کے لئے ایک دوسری انسانی قوت یعنی عقل و دانش اور خصوصاً اجتماعی عقلِ انسانی — بلکہ ہر دور کے اہلِ صلاح و صالحین کی تائید حاصل کرنے والے اصول و احکام سے مدد لینا بھی ضروری ہے۔

——— شاید یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم کتبِ سماویہ اور سابقہ انبیاء کرام کی تعلیمات کو بنیادی اہمیت دیتا ہے۔ اس طرح قرآن اور اسلام کے حوالہ سے بات کرتے ہوئے اس وقت ہمارا اصل موضوع مطلقاً "ضمیر" نہیں بلکہ قرآن و سنّت کی روشنی میں پروردہ و تربیت یافتہ ضمیر ہے جسے ہم دینی ضمیر کہہ سکتے ہیں۔ تمام انبیاء کی بعثت کا مقصد اسی دینی ضمیر کی تربیت یا ضمیر کی دینی تربیت تھا کیونکہ تزکیۂ نفوس کی اصل اور مضبوط اساس یہی ہے۔

قرآن کریم کی رُو سے نہ صرف انفرادی بلکہ اجتماعی دینی ضمیر کی تربیت ضروری ہے۔ جس طرح انسانی حواس بیماری، ضعف یا فقدان کا شکار ہو سکتے ہیں، اسی طرح انسان کی یہ اندرونی قیمتی استعداد — ضمیر — بھی اس قسم کی آفات کی زد میں آ سکتی ہے۔ اس لئے قرآن کریم نے اس باطنی حس کو زندہ، استوار اور فعال و بیدار رکھنے پر نہ صرف زور دیا ہے بلکہ اس کیلئے عملی تدابیر بھی بیان کی ہیں یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ انسان کے اندر محض خارجی ذرائع سے کوئی تبدیلی نہیں لائی جا سکتی جب تک خود اس کے اندر تبدیلی نہ پیدا ہو یہ بات افراد و اقوام سب پر صادق آتی ہے۔ اسی لئے قرآن کریم نے

انسان کی ان اندرونی قوتوں یعنی لُب و عقل اور قلب و ضمیر کو مخاطب کیا ہے۔ اور اپنی اس فطری استعداد سے مطلقاً کام نہ لینے والوں کو " کالانعام بل ھم اضل" کہا ہے۔

ضمیر کو حق شناس بنانے، اسے بیدار رکھنے اور اس کی تقویت اور صحیح تربیت کے لئے قرآن کریم نے حسب ذیل اقدامات و تدابیر کا ذکر کیا ہے۔

● سب سے پہلی چیز ایمان باللہ ہے۔ "کسی فلسفی کا قول ہے کہ عقیدہ یا (ایمان) کے بغیر ضمیر کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی عدالت بغیر جج کے ہو" —

ایمان باللہ کے بغیر قلب ایک بنجر زمین ہے لیکن جب ایمان اعماق قلب تک پہنچتا ہے تو ضمیر کا پودا اس میں برگ و بار لانا شروع کر دیتا ہے۔ اور بقول باخرؔ قلب مومن کے پودے کی خوشبو انسان کے باطن سے نکل کر اس کے ظاہر یعنی اس کے اعمال میں سرایت کرنا چاہتی ہے — یہ اس کا فطری تقاضا ہے۔

● ذکر اللہ یعنی اللہ تعالیٰ اور اس کے احکام کی بار بار یاد، اس کا اعادہ اور تکرار دینی ضمیر کی تربیت کے لئے دوسرا اہم اقدام ہے اسلامی عبادات ا[illegible] دینی ضمیر بلکہ اجتماعی دینی ضمیر کو زندہ و بیدار رکھنے کا ایک نہایت مؤثر ذریعہ ہیں۔ اور شاید اسی لئے تمام اسلامی عبادات کو ایک اجتماعی رنگ دیا گیا ہے۔

انفرادی سطح پر بھی عبادات انسان کے لئے اخلاقی و دینی ضمیر کی بیداری کا باعث بنتی ہیں۔ کیونکہ ہر عبادت سرّاً و علانیۃً رب کے ساتھ ربط و تعلق کا باعث بنتی ہے۔ اور ظاہر و باطن و سرًا و علانیۃً یکسانیت ہی سے ضمیر مطمئن ہو سکتا ہے۔ حواس کی لذتوں کی طرح ضمیر یا باطن کی لذت کا سامان اس یکرنگی میں پوشیدہ ہے۔

● توبہ اور رجوع الی اللہ — ضمیرِ انسانی کو زندہ اور بیدار رکھنے کے لئے ایک نہایت موثر ذریعہ بھی ہے اور بیداریٔ ضمیر کی علامت بھی ہے۔ جب ضمیر کی آواز کسی "جہالۃ" کے باعث نظر انداز کر کے انسان کوئی بُرا کام کر بیٹھتا ہے تو قرآن کریم کے حکم کے مطابق ایسے آدمی نے گویا اپنے ضمیر کو سخت خطرے

میں ڈال دیا ہے - اسے فوراً اپنے ضمیر کو موت سے بچانا چاہیئے - جس طرح کسی گرے ہوئے مکان کے ملبہ کے اندر سے فوری کارروائی کے ذریعے کسی کی جان بچائی جا سکنے کے امکانات ہوتے ہیں - اسی طرح گناہ کے اس ملبے سے ضمیر کو نجات دلانے کے لئے "یتوبون من قریب" پر عمل کرنا ضروری ہے -

توبہ اور اصلاح و استغفار کے سلسلے میں قرآن کریم کے تمام احکام کا مقصد انسان کی اس باطنی استعداد کو فنا سے بچانا اور اسے برقرار رکھنا ہے -

قرآن کریم میں توّابین کا صیغہ مبالغہ ایک سے زیادہ جگہ آیا ہے جس میں تکرار کا مفہوم موجود ہے - قرآن کریم میں ہی دوسری جگہ صفاتِ مومنین میں "ولم یصرّوا علی ما فعلوا" کا ذکر بھی آیا ہے - ایک حدیث شریف میں "لم یُصِرّ من استغفر وان عاد فی الیوم سبعین مرّۃ" — توبہ و استغفار کا یہ عمل پیہم انسان کو اس عدمِ اصرار کی منزل تک پہنچانے کا بہترین ذریعہ ہے -

ضمیر بیدار کی اصل اہمیت گناہ سے بچانے میں نہیں بلکہ گناہ پر پچھتانے اور ندامت آشنا کرانے میں ہے - اصل توبہ ندامت ہی کا نام ہے انما التوبۃ الندم — اور ضمیر کی یہ ندامت کوئی معمولی شے نہیں یہ تو اجرائے حد سے بھی سخت تر شئی ہے -

● دینی ضمیر اور خصوصاً اجتماعی دینی ضمیر کو زندہ و بیدار رکھنے کے لئے ہی قرآن کریم نے ایک نظامِ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر پر زور دیا ہے — امر بالمعروف - تواصی بالحق والصبر اگر ضمیرِ دینی کے لئے باعث نشاط و قوت ہیں تو نہی عن المنکر دینی ضمیر خصوصاً اجتماعی دینی ضمیر کو موت و ہلاکت سے بچانے کے لئے ناگزیر ہے - قوموں اور ملتوں کی حیاتِ اجتماعیہ میں منکرات وبا کی طرح پھیلتے ہیں - اور اگر فوری تدارک اور مسلسل نگرانی نہ کی جائے تو اجتماعی ضمیر کی موت واقع ہو جاتی ہے — بنی اسرائیل کا واقعہ قرآن و حدیث میں اس کی واضح مثال کے طور پر بیان ہوا ہے - کانوا لا یتناھون

عن منکر فعلوہ ـــــ کے باعث ہی وہ لعنت کے مستحق ٹھہرے تھے۔
ـــــ اسلامی حکومت کے چار اہم اور بنیادی فرائض میں آخری نہی عن المنکر ہے (الذین ان مکنٰھم ۔ ۔ ۔ ۔ عاقبۃ الامور سورۃ الحج:۴۱)
پہلے تینوں امور (صلوٰۃ زکوٰۃ امر بالمعروف) اگر ضمیر کی غذا ہیں تو وجودِ منکر ضمیر کے لئے سمّ قاتل ہے ـــــ نہی عن المنکر سے غفلت پہلے تین امور کے مثبت اثرات پر پانی پھیر دینے والی بات ہے ۔کیا کیا آپ کسی کو طاقت ور اور مفید غذائیں کھلانے کے ساتھ تھوڑا سا زہر کھلا دینے کو معمولی بات سمجھ سکتے ہیں؟۔ نماز و زکوٰۃ کا اہتمام کرنے والے اگر صواحبِ یوسف کے ساتھ سمجھوتے بھی کرتے پھیریں تو ع "ناطقہ سر بگریباں ہے اسے کیا کہیے!"
منکرات کو مٹانے کے اس امتحان میں عوام کے لئے تو چلیئے اضعف الایمان کا گریڈ حاصل کرنے کا امکان موجود ہے ـــــ مگر "لمبے ہاتھوں والے" اور "لمبی زبانوں والے" اصحاب ابلاغ کے ایمان و ضمیر کے متعلق کیا رائے قائم کی جاسکتی ہے؟

● ـــــ ضمیر بیدار کی رعایت کے حق میں قرآن کریم کا یہ حکم بھی قابل ذکر ہے کہ بیدار اور زندہ ضمیر والوں کی حوصلہ افزائی کرنی چاہیئے ۔ مردہ ضمیر والے بڑے صاحبوں پر اپنی توجہات مرکوز کرنے کی بجائے باضمیر عوام کو تلاش کیجئے ـــــ "عبس و تولیٰ" کے واقعہ نزول میں کیا اس حقیقت کی طرف اشارہ نہیں ہے

● ـــــ جب ایمان ، ذکر اللہ ، تقویٰ اور خشیۃ اللہ کے ذریعے ضمیر کی تربیت و تقویت کی جائے تو وہ اس درجہ بیدار اور اتنا حساس ہو جاتا ہے کہ اس مرحلہ پر ضمیر کا فتویٰ فقہاء کے فتووں پر قابل ترجیح ہو جاتا ہے تقویٰ کے ذریعے درجۂ فرقان تک پہنچ جانے پر ہی "استفت قلبک" کا اطلاق ہوتا ہے ۔
ـــــ البر ما اطمانت الیہ النفس و اطمان الیہ القلب والاثم ما حاک فی النفس و تردد فی الصدر اسی درجے کے لئے کہا گیا ہے ۔

دینی ضمیر کی نیند یا موت کی سب سے زیادہ خطرناک صورت علماء اور رجال دین کے ضمیروں کا سو جانا یا مر جانا ہے۔ قرآن کریم یہود کے بارے میں کہا گیا ہے کہ "لولا ینھاھم الربانیون والاحبار عن قولھم الاثم و اکلھم السحت لبئس ما کانوا یصنعون"، ایسے بے ضمیر علماء سے ہدایت حاصل کرنے کی بجائے آدمی کے لئے اپنے دینی ضمیر سے کام لینا شاید زیادہ بہتر ہے — معرّی نے اسی لئے کہا تھا ؎

والعصا للضریر خیرٌ من القا — ئد فیہ الفجور والعصیان

قرآن کریم نے اپنے بعض احکام میں صورت امتثال یا کیفیت تعمیل کا فیصلہ خود ضمیر بیدار پر چھوڑ دیا ہے۔ اس کی ایک بڑی مثال "قل العفو" میں اس "العفو" کا تعین ہے ضرورت سے زائد کے اس تعین میں ہی آدمی کے ایمان و ضمیر کا سب سے بڑا امتحان ہے — رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، صحابہ کرامؓ اور خصوصاً حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ نے اس کی جو عملی مثال قائم کی وہ تاریخ عالم میں اپنی نظیر آپ ہے کہ حکمران ہوتے ہوئے خوراک، لباس اور مکان کے لحاظ سے اپنا معیار زندگی اس سے اونچا نہیں ہونے دیا جو وہ اپنی رعیت کے افراد کو کم از کم مہیا کر سکتے تھے۔

قرآن کریم کی آیت "اقرء کتابک کفی بنفسک الیوم علیک حسیبا" سے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میزان ضمیر ہی میزان آخرت ہوگی — ضمیر بیدار کو اسی دنیا میں محاسب اعمال بنانا ہی حساب آخرت کی سب سے بڑی اور عمدہ تیاری ہے۔

قرآن کریم سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ "نہی النفس عن الھوی" اگر ضمیر کی بیداری کا ثبوت ہے — اور ایثار الحیوۃ الدنیا اگر ضمیر کی قطعی موت کا ثبوت نہ بھی ہو تو بھی خیریت کی علامت ضرور نہیں ہے۔

اور ضمیر کی موت ہی دلوں پر لگنے والی وہ خدائی مہر ہے جس کے بعد انسان کے اندر سے کسی تبدیلی کے امکانات بالکل ختم ہو جاتے ہیں۔

اعاذنا اللہ من ھذا

رمضان المبارک کا بہترین تحفہ

ڈاکٹر اسرار احمد کی مقبولِ عام تالیف

مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق

خود پڑھیے اور دوستوں اور عزیزوں کو تحفتہً پیش کیجیے ۔

دورانِ ماہِ رمضان اہل وعیال اور اعزّہ واقارب کے ساتھ اجتماعی مطالعہ کیجیے !

(نوٹ) اس کتابچے کا انگریزی اور عربی ترجمہ بھی شائع ہو چکا ہے فارسی ترجمہ زیرِ طباعت ہے
اس کے حقوقِ اشاعت نہ ڈاکٹر صاحب کے حق میں محفوظ ہیں نہ انجمن کے !

شائع کردہ

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

۳۶۔کے ماڈل ٹاؤن لاہور ۔ فون ۸۵۲۶۱۱

دورِ حاضر میں علامہ اقبال مرحوم کے خطبات کے بعد

حکمتِ قرآنی پر عظیم ترین تصنیف

قرآن اور علمِ جدید

تالیف

ڈاکٹر محمد رفیع الدین

ایم اے، پی ایچ ڈی، ڈی لٹ

عالمی فتنۂ ارتداد اور ڈارون، میکڈوگل، فرائڈ، ایڈلر، کارل مارکس اور میکاولی کے نظریات کا حکمت قرآنی کی روشنی میں محققانہ جائزہ

شائع کردہ:۔ آل پاکستان اسلامک ایجوکیشن کانگریس

بڑے سائز کے ۶۰۰ صفحات —— قیمت -/۵۰ (علاوہ محصول ڈاک)

—— منگانے کا پتا: ——

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن

۳۶-کے، ماڈل ٹاؤن - لاہور، فون: ۸۵۲۶۱۱

مرکزی **انجمن خدّام القرآن** لاھور

کے قیام کا مقصد

منبع ایمان ـــــ اور ـــــ **سرچشمۂ یقین**

قرآنِ حکیم

کے **علم و حکمت** کی

وسیع پیمانے ـــــ اور ـــــ اعلیٰ علمی سطح

پر تشہیر و اشاعت ہے

تاکہ امّتِ مسلمہ کے فہیم عناصر میں **تجدیدِ ایمان** کی ایک عمومی تحریک برپا ہو جائے

اور اس طرح

اسلام کی نشاۃِ ثانیہ ـــ اور ـــ **غلبۂ دینِ حق کے دورِ ثانی**

کی راہ ہموار ہو سکے

وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ